بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِکُمْ وَلٰکِن رَّسُولَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیِّیْنَ وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا. (الاحزاب)

محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

عقیدۂ ختم نبوت

اور

نزول مسیح

جدید تحقیق اور اضافے کے ساتھ تیسرا ایڈیشن

مؤلف

قمر احمد عثمانی

ابن شیخ الاسلام حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اهتمام : محمد احسن تہامی

مطبع : گنج شکر پرنٹرز

تاریخ اشاعت : 2007

قیمت : 90 روپے

ملنے کا پتہ: امتیاز پائپ سٹور، 153-154 عالم خان روڈ، راولپنڈی
فون نمبر: 051-5531396

دارالتذکیر

رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار

لاہور۔54000 فون : 7231119

ای میل: info@dar-ut-tazkeer.com

ویب سائٹ: www.dar-ut-tazkeer.com

فہرست

حرفِ اوّل

عقیدۂ ختم نبوت جس کی قطعیت پر از روئے قرآن و احادیث صحیحہ ہمارا ایمان ہے اور ہم ایک لمحے کے لیے بھی مستقل نبوت تو کیا کسی ظلّی و بروزی نبوت کے تصور کو بھی تسلیم نہیں کر سکتے، تو یہ عقیدہ جزو ایمان ہونے کی حد تک تو بجا ہے مگر جب ہم اس کے علی الرغم ان عقائد کو بھی اپنے بنیادی اور اجماعی عقائد میں شامل کر لیتے ہیں۔ جن سے عقیدۂ ختم نبوت کی بنیاد ہی متزلزل ہو جاتی ہے اور پھر ان مزعومہ عقائد کی صحت و قطعیت پر بھی اتنا ہی اصرار کرتے ہیں جتنا عقیدۂ ختم نبوت پر، تو اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم نے اس عقیدے کو محض جوشِ عقیدت میں اپنا تو لیا ہے لیکن ہم نے اس کے اپنے مقتضیات اور اس کے مخالف عقائد کے نتائج و عواقب پر پوری سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا ورنہ ہم ان عقائد کو جو محض ظنیات یا بقول مولانا عبیداللہ سندھیؒ استنباطات و اخذ کردہ دلائل پر مبنی ہیں (اور یہ اخذ کردہ دلائل و استنباطات شک و شبہ سے خالی نہیں[1]) ہرگز اپنے بنیادی اور اجماعی عقائد میں شامل نہ کرتے۔

ہماری مذہبی عقیدت اور سادہ لوحی کا یہ عالم ہے کہ دین و مذہب کے نام پر ہمارے سامنے جو بھی تصور پیش کر دیا جائے، ہم اس کے ما لہ وما علیہ پر غور کیے بغیر بڑی معصومیت کے ساتھ اسے حرزِ جان اور جزو ایمان بنا لیتے ہیں، مگر اس کے نتائج کی مطلق پروا نہیں کرتے کہ اس کی زدّ کہاں اور کس پر پڑ رہی ہے؟

ان عقائد میں جن کی براہِ راست زد عقیدۂ ختم نبوت پر پڑتی ہے۔ حیاتِ مسیحؑ، نزولِ مسیحؑ اور ظہور مہدی کے مزعومہ عقائد شامل ہیں اور ان میں سے حیاتِ مسیحؑ اور نزولِ مسیحؑ کا عقیدہ سرِفہرست ہے، جس سے عقیدۂ ختم نبوت کی عمارت ہی منہدم ہو جاتی ہے۔

دراصل یہ تینوں عقیدے حضراتِ اہل تشیع کے بارہویں امام، امام غائب اور امام منتظر

---

[1] امالی "الہام الرحمٰن" از مولانا عبیداللہ سندھیؒ۔

کے عقیدہ کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔ انصار بنی ہاشم کے صابیوں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے موالی یہودیوں نے سب سے پہلے شیعان علی (رضی اللہ عنہ) میں اس عقیدے کی جڑیں مضبوط کیں۔ جب وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئے تو پھر ان کی تائید وحمایت کے ساتھ یہی عقیدہ تھوڑی سی تبدیل شدہ صورت میں ظہور مہدی آخرالزمان کے نام پر اہل سنت کے عقائد میں داخل کر دیا گیا۔ اس مقصد کے لیے باقاعدہ روایتیں وضع کی گئیں اور انہیں بڑی ہوشیاری اور چابک دستی کے ساتھ ان کی کتب احادیث میں داخل کیا گیا۔ جہاں تک عقیدۂ ظہور مہدی کا تعلق ہے تو اس سلسلے کی وضعی روایتیں موطا امام مالکؒ، بخاریؔ اور مسلمؔ جیسی معتبر کتب احادیث میں تو راہ نہ پا سکیں مگر ان سے کم تر درجے کی دیگر کتب احادیث میں کسی نہ کسی طرح شامل کر دی گئیں[1] لیکن حیاتِ مسیحؑ اور نزولِ مسیحؑ کی روایات تو بخاریؔ و مسلمؔ جیسی مستند کتابوں میں بھی داخل ہو گئیں جس کے بعد ہمارے لیے ان کو بطور عقیدہ تسلیم کرنا لازمی ہو گیا کیونکہ ہم نے ان دونوں کتابوں کو صحیحین اور بخاری کو تو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کے طور پر پہلے ہی تسلیم کیا ہوا ہے لیکن صاحبانِ فکر و نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ ان کتابوں کی صحت و معیار کا پایہ کتنا ہی بلند سہی مگر ان میں بیان کردہ ہر روایت کی صحت ثابت نہیں کی جا سکتی اور نہ اسے دلیل قطعی کے طور پر تسلیم کیا جا سکتا ہے چنانچہ علمائے محدثین نے (صحیحین) بخاریؔ و مسلمؔ کی کم و بیش (200) دو سو روایتوں کی صحت پر جرح و تنقید کی ہے (یہاں ان کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے[2])۔

اس مقام پر ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کے بنیادی یا اجماعی عقائد صرف وہی ہو سکتے ہیں جن کی قطعیت قرآن یا سنت ثابتہ سے ثابت ہو۔ اخبار احاد، ظنی مرویات یا اخذ کردہ دلائل و استنباطات کسی دینی عقیدے کی بنیاد قرار نہیں پا سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دَور کے اہلِ علم حضرات اور ارباب فکر و نظر ان مسائل میں مختلف الرائے رہے ہیں چنانچہ حضرت عبداللہ بن

---

[1] شیخ الحدیث شبیر احمد ازہر میرٹھی نے مہدی سے متعلق روایات کی تنقید ایک مبسوط و مدلل مقالہ میں کر دی ہے جو دارالتذکیر لاہور سے چھپ چکا ہے۔ (امتیاز)

[2] شیخ الحدیث شبیر احمد ازہر میرٹھی نے مطالعہ صحیح بخاری میں 150 روایات بخاری پر تنقید کر کے ان روایات کا غلط ہونا دلائل و براہین سے واضح کر دیا ہے۔ (امتیاز)

عباسؓ عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے قائل تھے اور علمائے متقدمین میں امام ابن حزم اور امام ابن تیمیہ نے نزولِ مسیحؑ کے مسئلہ کو اختلافی مسئلہ قرار دیا ہے (دیکھیے "**مراتب الاجماع، لابن حزم اور نقد مراتب الاجماع، لامام ابن تیمیۃ**")۔ ہمارے زمانے میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ تمنا عمادی پھلواروی، علامہ مولانا موسیٰ جاراللہؒ، شیخ نور محمد مرشد المکیؒ، علامہ شاہ محمد جعفر ندوی، علامہ اقبالؒ، شیخ محمود شلتوت مصری، علامہ سید رشید رضا مصری اور مولانا امین احسن اصلاحی جیسے نامور علمائے دین اور ارباب علم و دانش نزولِ مسیحؑ اور ظہور مہدی کے عقیدوں کی صحت کو تسلیم نہیں کرتے۔ مولانا تمنا عمادی مرحوم و مغفور نے علامہ اقبالؒ کی فرمائش پر انتظار مہدی اور نزولِ مسیحؑ کی روایات پر فن اسماء الرجال کی روشنی میں برسوں پہلے جو تنقید فرمائی تھی وہ کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے، اس لیے ہم نے متعلقہ روایات کی صحت و عدم صحت کو اپنا موضوع نہیں بنایا۔ جو حضرات اس مسئلے کو از روئے روایات سمجھنے پر مصر ہوں وہ مولانا عمادی مرحوم کی تنقیدات کا مطالعہ کر لیں۔

اصولِ دین اور ان کی تعبیرات کے سلسلے میں ہمارا اصولی موقف ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے منسوب اس مشہور روایت میں بیان کردہ ہدایات پر عمل کریں کہ جب انہیں یمن کا حاکم مقرر کیا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا، لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کیسے کرو گے؟

اُنہوں نے عرض کیا: کتاب اللہ کے مطابق۔

آپؐ نے فرمایا: اگر تمہیں کتاب اللہ میں کوئی حکم نہ ملے۔

انہوں نے عرض کیا: تو پھر سنت (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی روشنی میں فیصلہ صادر کروں گا۔

آپؐ نے فرمایا: اگر وہاں بھی کوئی حکم نہ ملا۔

تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ جواب سن کر بہت خوش ہوئے اور آپ نے فرمایا: الحمدللہ حق تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے ایلچی کو وہی ہدایت فرمائی ہے جس سے اس کا رسولؐ راضی ہے!

چنانچہ پیش آمدہ معاملات و مسائل کے بارے میں ہم سب سے پہلے کتاب اللہ کی

طرف رجوع کرتے ہیں۔ اگر اس سے مکمل راہنمائی حاصل ہو جائے (جو اکثر حاصل ہو جاتی ہے) تو پھر کسی دوسرے ماخذ سے اعتنا نہیں کرتے۔ ہاں اگر کتاب اللہ میں کوئی حکم تو موجود ہو مگر اس کی تفاصیل و جزئیات بیان نہ کی گئی ہوں تو پھر شریعت کے دوسرے ماخذ سنت ثابتہ سے اس کی تفاصیل و جزئیات معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کی تعبیرات کو پورے شرح صدر اور طمانیت قلبی کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں اور اگر بالفرض دَورِ جدید کے عصری مسائل میں سے کسی مسئلے پر ہر دو ماخذ سے کوئی رہنمائی نہ مل سکے تو خیر القرون میں حضرات خلفائے راشدین کے فیصلوں، اجماع صحابہؓ و تعامل صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کہیں سے بھی (جسے قرآن نے سبیل المومنین قرار دیا ہے) اپنے مسائل و مشکلات کا حل تلاش کرنے کی سعی بلیغ کرتے ہیں۔ پھر اگر وہاں بھی کسی مسئلے کا حل دستیاب نہ ہو تو بالکل آخر میں ائمہ مجتہدین کے اقوال و آرا کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ اکثر و بیشتر ان کے قیاسات و اجتہادات قرآن و سنت ہی سے مستنبط اور اقرب الی الصواب ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے شرط یہی ہے کہ فقہا اُمت کا یہ قیاس و اجتہاد قرآن و سنت کی کسی نص قطعی سے مستنبط ہو، ورنہ کم از کم ان سے معارض نہ ہو، بصورت دیگر کوئی قیاس و اجتہاد مذکورہ دو صورتوں کے علاوہ ہمارے نزدیک کسی تیسری شکل میں قابلِ قبول نہیں ہے۔

چنانچہ ہم نے اپنے اسی اُصولی موقف کے تحت حیاتِ مسیحؑ اور نزولِ مسیحؑ کے تصور کو سب سے پہلے قرآن کریم کی بیان کردہ تصریحات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

فاروقِ اعظم سیّدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشہور قول ''حسبنا کتاب اللّٰہ'' پر نظری طور پر تو بحمد اللہ ہمیشہ اعتماد رہا ہے کہ ہمارے تمام مسائل و مشکلات کا حل قرآن کریم میں موجود ہے۔ لیکن عملاً اس کی تصدیق (حق الیقین کے درجے میں) اس وقت ہوئی جب احباب کے اصرار اور خود اپنے قلبی تقاضے کے تحت ہم نے حیاتِ مسیحؑ کے مشکل ترین موضوع پر قرآنی تصریحات کی روشنی میں غور کیا تو بحمد اللہ ہمیں کسی مرحلے پر بھی یہ احساس یا گمان نہیں ہوا کہ قرآن کی پیش فرمودہ وضاحتوں کے بعد اس کے سمجھنے میں کوئی تشنگی باقی رہ گئی ہے!

توقع ہے کہ قارئین محترم بھی زیرِ نظر اوراق کے مطالعے کے بعد ہماری رائے سے اتفاق کریں گے۔

عقیدۂ ختم نبوت کی موجودگی میں حیاتِ مسیحؑ اور نزولِ مسیحؑ کا تصور قلب و ذہن میں ہمیشہ

ہی کھٹکتا رہا کہ یہ دونوں تصورات ایک جگہ نہیں ٹھہر سکتے اگر عقیدۂ ختم نبوت برحق ہے تو کسی نبی کے آنے اور دین اسلام کو حقیقی غلبہ دلانے کا کوئی جواز نہیں بنتا کیونکہ ارشادِ ربانی ''ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلّہ (القرآن)'' وہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ (رسولؐ) اس (دین حق) کو تمام ادیانِ عالم پر غالب کر دے'' اور ''الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً (القران)'' آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور بطور دین تمہارے لیے اسلام کو پسند کر لیا'' اور ''و تمت کلمت ربک صدقاً و عدلاً'' (القرآن) ''اور آج تیرے ربّ کی بات سچائی اور عدل و انصاف کے ساتھ پوری ہو گئی'' اور ''یاتی من بعدی اسمہ احمدؐ'' (القرآن) ''میرے بعد ایک رسول آئے گا جس کا نام احمدؐ ہو گا'' اور فرمودۂ رسولؐ ''لا نبی بعدی'' (میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا) کی وضاحت و صراحت کے بعد کسی نبی کے آنے اور اسلام کو غلبہ دلانے کے کسی تصور کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی مگر یہ خلش قلب و ذہن ہی میں کھٹکتی رہی کبھی کھل کر اظہار خیال کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اللہ بھلا کرے بَرادرِ عزیز جناب محمد امتیاز صاحب گوالمنڈی راولپنڈی کا جنہوں نے 1992ء میں جب راقم الحروف سفرِ حج پر روانہ ہو رہا تھا تو الوداعی ملاقات میں یہ فرمائش کی کہ کعبۃ اللہ پر پہلی نظر پڑتے ہی ربّ کعبہ کے حضور یہ دعا فرمائیں کہ حق تعالیٰ جل شانہ اُمتِ مسلمہ کے تمام اختلافی و نزاعی مسائل بالخصوص عقیدۂ حیاتِ مسیحؑ و نزولِ مسیحؑ پر انشراح قلب و شرح صدر کی دولت سے نواز دیں۔ (آمین)

الغرض کعبۃ اللہ پر نظر پڑتے ہی آں عزیز کی یہ فرمائش یاد آ گئی اور میں نے بارگاہِ الٰہی میں دعا پیش کر دی جس کے بعد شرح صدر و انشراح قلب کی وہ دولت لازوال حاصل ہوئی کہ آج یہ عاجز قلب و نظر کے نہفتہ گوشوں میں چھپے ہوئے تصورات کو بلا خوف لومۃ لائم اس مختصر مضمون میں پیش کرنے کی جرأت و جسارت کر رہا ہے۔

وما توفیقی الا باللّٰہ العلی العظیم۔

یکے از عقیدت مندانِ عقیدۂ ختم نبوت

قمر احمد عثمانی

انتظار مہدی و مسیح
اور
علامہ اقبالؒ

میرے نزدیک مہدی، مسیحیت اور مجددیت کے متعلق جو احادیث ہیں، وہ ایرانی عجمی تخیلات کا نتیجہ ہیں۔ عربی تخیلات اور قرآن کی صحیح اسپرٹ سے ان کو کوئی سروکار نہیں۔

(علامہ اقبالؒ، بحوالہ فیض الاسلام اقبال نمبر 61)

مینارِ دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ
اب انتظارِ مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے

اقبالؒ

اسلام کے بنیادی عقائد

اسلام کے بنیادی عقائد وہی ہو سکتے ہیں جن کی قطعیت قرآن سے ثابت ہو جیسا کہ سورۃ البقرہ کے پہلے رکوع میں اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ ...... الخ اور وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ۔ میں غیب پر ایمان لانے، قرآن اور دوسری کتب سماوی پر ایمان لانے اور آخرت پر ایمان لانے کو اللہ کی طرف سے ہدایت پانے اور فلاح یاب ہونے کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے یا اسی طرح سورۃ البقرہ کے آخری رکوع میں اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۔ متذکرہ آیات میں آٹھ باتوں کو شرطِ ایمان قرار دیا گیا ہے۔ کتابِ الٰہی پر ایمان لانا، اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اُس کی نازل کردہ کتابوں پر، اُس کے بھیجے ہوئے انبیا و مرسلین کے مابین کوئی تفریق روا نہ رکھنے پر اور اللہ کے کلام کو سننے اور اس کی اطاعت کرنے کو شرائط ایمان میں شمار کیا گیا ہے۔ قرآن کریم اور کتب احادیث میں اس مضمون کی بے شمار آیات و روایات موجود ہیں جن کو بہ تکرار بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ایمان کے بنیادی اجزا جو کتابِ الٰہی سے ہی اخذ کیے گئے ہیں، انہیں ایمانِ مفصل اور ایمانِ مجمل میں بڑی جامعیت اور صراحت کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے۔ ایمانِ مفصل میں اللہ پر، اللہ کے فرشتوں پر، اللہ کی نازل کردہ کتابوں پر، اللہ کے بھیجے ہوئے انبیا پر، یومِ آخرت پر، تقدیر کے خیر و شر کے ہر پہلو کے منجانب اللہ مقرر کیے جانے پر اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ اُٹھائے جانے پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ایمان مجمل میں اللہ پر جیسا کہ وہ اپنے اسما و صفات کے ساتھ ہے، ایمان لانے اور اس کے تمام احکام کو قبول کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

ظنیات یا اخذ کردہ استنباطات کی بنیاد پر قائم کردہ عقائد

ایمان کے متذکرہ اجزا کے علاوہ جو عقائد و نظریات خود قرآن ہی سے ثابت ہیں، مثلاً

عقیدۂ ختم نبوت یا اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم وغیر ذالک کے علاوہ کسی ایسے عقیدے کو جس کی قطعیت کتاب الٰہی یا سنت ثابتہ سے ثابت نہ ہو بطورِ عقیدہ تسلیم کرنا سراسر زیادتی بلکہ دین میں خودساختہ مداخلت کے زمرہ میں شامل ہوگی۔ نزولِ مسیحؑ اور ظہورِ مہدی کے مزعومہ عقائد کے بارے میں ہم گزشتہ اوراق میں پوری وضاحت اور صراحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ یہ عقائد بقول مولانا عبیداللہ سندھی تلمیذ خاص حضرت مولانا محمود الحسن (یکے از بانیانِ دارالعلوم دیوبند) استنباطات واخذ کردہ دلائل پر مبنی ہیں اور یہ اخذ کردہ دلائل واستنباطات شک وشبہ سے خالی نہیں، چنانچہ مولانا موصوف حیاتِ مسیحؑ، نزولِ مسیحؑ اور ظہورِ مہدی کے عقائد کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

> ''متوفیک'' کا معنی ''ممیتک'' ہے (یعنی میں تجھے موت دوں گا) اور جو لوگوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے بارے میں مشہور ہے، پس یہ یہودیوں اور صابئہ کی عبارتیں ہیں جو مسلمانوں میں مشہور ہوئیں۔ عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے بعد انصارِ بنی ہاشم جو کہ صابئہ میں سے تھے، ان کے ذریعہ سے اور ان یہودیوں نے مشہور کیا جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے موالی میں سے تھے۔ انہوں نے یہ مشہور محبت سے نہیں بلکہ اسلام اور مسلمانوں سے بغض کی وجہ سے کیا ہے جبکہ انہوں نے اس آیت پر غور نہیں کیا ''ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ'' اور اس کو (یعنی حیاتِ عیسیٰ) کو عقیدہ بنالیا۔ اس آیت کا معنی صرف اجتماعیت عامہ پر یقین رکھنے والے ہیں سمجھتے ہیں جو اس میں ماہر ہوئے ہیں۔ جو لوگ ان روایات پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کو ہمارے پاس لاتے ہیں وہ علم اجتماعیہ میں بعید ترین لوگوں میں سے ہیں جبکہ وہ آیت کے معنی سے جاہل ہیں۔ پس یہ لوگ ان روایات کو قبول کرتے ہیں اور ان سے متاثر ہوتے ہیں اور یہ بات پوشیدہ نہیں کہ علومِ اسلامیہ کے تمام شعبوں کا مرجع ومنبع قرآن عظیم ہے

> اور اس میں کوئی آیت ایسی نہیں جو صراحۃً اس بات پر دلالت کرے کہ عیسیٰ علیہ السلام بقید حیات ہیں اور نازل ہوں گے۔ سوائے اخذ کردہ (استنباطات و) دلائل کے اور بعض تفسیروں کے۔ اور یہ یعنی اخذ کردہ دلائل اور تعبیرات شک وشبہ سے خالی نہیں ہیں۔ جو چیز اس درجہ کی ہو، کیسے ممکن ہے کہ ہم اس کو عقیدہ اسلامیہ کی بنیاد بنا ڈالیں۔ (ترجمہ تفسیر الہام الرحمٰن ص 49 الجزء الثانی)

اس اقتباس کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ ان عقائد کو اخذ کردہ دلائل و استنباطات کے زمرہ میں ہم نے بطور خود شامل نہیں کیا بلکہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے تلمیذ رشید مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے نظریہ کی تائید کی ہے جو حضرت شیخ الہند کے شاگرد ہونے کے علاوہ خود بھی ممتاز درجہ کے عالم دین اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسے بزرگانِ دین کے ہم عصر اور علمی مرتبے میں ان ہر دو حضرات سے کسی طرح کم تر نہ تھے۔ علاوہ ازیں عصر حاضر میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جو برصغیر میں علوم حدیث اور علومِ قرآنی کے سب سے پہلے شارح ومفسر تھے، ان کے علمی نظریات اور فلسفہ ولی الٰہی کے سب سے ممتاز شارح و ترجمان بھی یہی ہیں۔

جہاں تک ان روایات کا تعلق ہے جن کو بنیاد بنا کر نزول مسیح علیہ السلام اور ظہورِ مہدی کے عقائد کو اسلام کے بنیادی اور اجماعی عقائد میں شامل کرلیا گیا ہے، ان روایات کے باہمی اختلافات وتضادات کو عالم عرب کے شہرۂ آفاق عالم دین سابق شیخ الجامع الازہر مصر علامہ محمودؒ شلتوت نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> مفسرین اس بارے میں اوّل تو ان روایات پر اعتماد کرتے ہیں جن میں دجال کے بعد نزولِ مسیح کا ذکر ہے۔ یہ روایاتِ مضطرب اپنے الفاظ اور معانی میں اس قدر مختلف ہیں کہ ان میں تطبیق ممکن نہیں۔ اس اَمر کی تصریح خود علمائے حدیث نے کی ہے۔ مزید برآں یہ وہب بن منبہ اور کعب الاحبار کی روایات ہیں جو اہل کتاب میں مسلمان ہوئے تھے۔

علمائے جرح وتعدیل کے نزدیک ان راویوں کا جو درجہ ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مفسرین کی دوسری دلیل وہ روایت ہے جو ابو ہریرہؓ سے مروی ہے اور جس میں انہوں نے نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کی خبر دی ہے۔ اگر یہ حدیث صحیح تسلیم کرلی جائے تب بھی یہ خبر واحد ہے اور علمائے اُمت کا اجماع ہے کہ خبر واحد سے نہ تو کوئی عقیدہ ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی امورِ غیبیہ کے بارے میں اس پر اعتماد کرنا درست ہے۔ مفسرین کی تیسری دلیل وہ بیان ہے جو حدیث معراج میں آیا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمانوں کی طرف صعود کیا اور یکے بعد دیگرے آسمانوں کو کھولتے گئے تو دوسرے آسمان پر حضرت عیسیٰؑ اور ان کے خالہ زاد بھائی حضرت یحییٰ علیہ السلام سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس دلیل کی عنکبوتیت خود اس بیان سے واضح ہے۔ تمام علما تسلیم کرتے ہیں کہ معراج میں[1] حضورؐ بہت سے انبیا سے ملے اور یہ ملاقات محض روحانی تھی۔ اگر جسمانی تھی تو ماننا پڑے گا کہ جس طرح حضرت عیسیٰؑ زندہ اُٹھالیے گئے اسی طرح باقی انبیا بھی زندہ اُٹھالیے گئے ہوں گے اور حضرت یحییٰ علیہ السلام تو خصوصاً زندہ اُٹھائے گئے ہوں گے کیونکہ وہ تو حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ ہی ملے تھے، تو کیا تمام انبیا کا پھر نزول ہوگا۔

یہاں مفسرین کی اس بات کو بھی مدنظر رکھیے کہ جب وہ رفعہ اللہ الیہ آیت قرآنی کا مفہوم بیان کرتے ہیں تو حدیث معراج سے استنباط کرتے ہیں۔ چونکہ معراج میں حضورؐ نے عیسیٰؑ کو دوسرے آسمان پر دیکھا اس لیے رفعہ اللہ الیہ کے معنی ہیں اللہ نے عیسیٰؑ کو آسمان پر اُٹھالیا لیکن جب حدیث معراج کے سلسلے میں ان سے کہا جاتا ہے کہ ممکن

[1] قرآن میں نہ ہی معراج کا لفظ ہے اور نہ ہی نبی کریمؐ آسمان پر تشریف لے گئے۔ قرآن میں اسریٰ کا ذکر ہے وہ بھی بقول امین احسن اصلاحی خواب کا واقعہ ہے۔ (امتیاز)

ہے دوسرے انبیا کی طرح عیسیٰؑ سے بھی روحانی ملاقات ہوئی ہو تو وہ جھٹ کہہ دیتے ہیں، واہ جی! قرآن میں آچکا ہے بل رفعہ اللہ گویا اس طرح یہ لوگ جب حدیث کی تشریح کرتے ہیں تو اپنے مزعومہ معانی پر آیت کو دلیل گردانتے ہیں اور جب آیت کی تفسیر کرتے ہیں تو حدیث کے مزعومہ مفہوم کو بطورِ سند لاتے ہیں:

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

علامہ موصوف کی ان تصریحات کے بعد متذکرہ روایات کے تضادات واختلافات کی حقیقت پوری طرح واضح ہوجاتی ہے اور رفعِ مسیح ونزولِ مسیح کے بارے میں علامہ موصوف نے اس موضوع پر اور اپنے علم کے مقام ومرتبہ کے اعتبار سے اپنے فتویٰ میں اس موضوع کے ہر ہر جزو پر جو عالمانہ بحث کی ہے وہ اسی کتاب میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے اور علامہ تمنا عمادی پھلواری مرحوم نے علامہ اقبالؒ کی فرمائش پر اپنی کتاب (انتظار مہدی ومسیح) میں متعلقہ روایات موضوعہ کے ضعف بلکہ دجل وکذب کا جس طرح قطعیت وحجیت کے ساتھ پردہ چاک کیا ہے اور اصول روایت ودرائیت کے اعتبار سے فن اسماء الرجال کی روشنی میں جو عالمانہ بحث کی ہے اسے ان کی کتاب میں دیکھا جاسکتا ہے۔[1]

اسلام کے بنیادی اور شرعی ماخذ

اسلام کے بنیادی اور شرعی ماخذ کے سلسلے میں جو عام طور پر چار مآخذوں کتاب، سنت، قیاس واجتہاد اور اجماعِ اُمت کو بنیادی ماخذ قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ ہمارے نزدیک جس کو ہم نے پوری وضاحت وصراحت کے ساتھ کتاب کے حرفِ اوّل میں بیان کردیا ہے، یہ چار نہیں بلکہ صرف تین ہیں۔ یعنی کتاب وسنت اور قیاس واجتہاد اور چوتھا ماخذ یعنی اجماع جس کی عام طور پر دہائی دی جاتی ہے اور اس کے انکار کو مستلزمِ کفر قرار دیا جاتا ہے، اس کی اپنی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے کیونکہ اسے زیادہ سے زیادہ قیاس واجتہاد کی ایک صورت قرار دیا جاسکتا ہے، جس پر عہدِ صحابہ یا بعد کے علمانے قرآن وسنت کی روشنی میں کسی نصِ قطعی کی بنیاد پر کوئی رائے قائم کرلی ہو اور اس پر

[1] الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ کراچی نے یہ کتاب بھی چھاپ دی ہے۔ (امتیاز)

تمام علما اُمت متفق الخیال ہو گئے ہوں۔ اس سلسلے میں ہم نے اپنی کتاب ''نفاذِ اسلام اور درپیش مسائل''، میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، جسے یہاں حرف بہ حرف نقل کیا جارہا ہے۔

اجماع دلائل شرعیہ میں سے ایک دلیل شرعی تو ضرور ہے لیکن اس کی وہ حیثیت ہرگز نہیں ہے جو ہمارے علمائے متاخرین نے قرار دے دی ہے کہ اجماع کا انکار مستلزم کفر ہے اور اس کا منکر کافر و مرتد یا واجب القتل ہے۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اجماع کی وہ حیثیت ہرگز نہیں ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کی ہے۔ کتاب وسنت[1] سے جو بات ثابت ہو جائے وہ شریعت بن جاتی ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ جو بات فقہائے اُمت کی کثرتِ رائے سے ثابت ہو جائے وہ بھی شریعت بن جائے۔ قرآن وسنت سے ثابت شدہ احکام میں کسی مسلمان کو دَم مارنے اور چون وچرا کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی جبکہ فقہا اور علمائے اُمت کی اجتہادی رائے کے اتفاق کی صورت میں ہر مسلمان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ان سے دریافت کر سکے کہ انہوں نے یہ رائے کس بنیاد پر قائم کی ہے کیونکہ محض فقہا کی رائے یا ان کا اجتہاد حجت شرعی نہیں ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل[2] کر دیا اور اپنے انعام کو تم پر پورا کر دیا۔ اور دین ہونے کے اعتبار سے اسلام کو تمہارے لیے پسند کر لیا۔'' (3:5)

اجماعِ اُمت، تعاملِ اُمت، قیاس واجتہاد اور علما وفقہا کے اقوال وآرا، بہت بعد کی چیزیں ہیں جبکہ تکمیل دین کا اعلان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں آخری وحی کے ذریعہ کیا جا چکا ہے۔ جو دین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مکمل ہو چکا ہے، مسلمان اُسی

---

1 سنت عمل بالقرآن کو کہا گیا ہے اور جیسا کہ علامہ شاطبی نے الموافقات میں کہا ہے سنت کی اصل قرآن میں ہونی چاہیے۔ لہٰذا دین کا تنہا ماخذ قرآن ہے۔ سنت قرآن پر عمل کا نام ہے۔ (امتیاز)

2 اکمال کے معنی کسی چیز کو اس کی حدِ کمال تک پہنچانا اور اتمام کے معنی کسی کام کو پورا پورا انجام دینا ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہ ہو۔

دین کو ماننے کے مکلّف ہیں اور اسی کے کسی حصے کے انکار پر کافر و مرتد قرار دیے جاسکتے ہیں۔ اور یہ حقیقت کسی دلیل وثبوت کی محتاج نہیں ہے کہ آپ کی حیاتِ طیبہ میں قرآن وسنت کے علاوہ دین کی کوئی دوسری بنیاد موجود نہ تھی۔ مختلف فقہی مکاتبِ فکر کا وجود تو صدیوں بعد کی بات ہے، اجماعِ صحابہؓ اور تعاملِ خلفائے راشدین بھی عہد رسالت کے بعد کی چیزیں ہیں۔ قرآنِ کریم میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ:

''اے مسلمانو! اور اللہ ہی نے تمہاری طرف قرآن نازل کیا جو واضح اور نکھارا ہوا ہے (جس میں کوئی ابہام یا اجمال نہیں ہے) اور جنہیں ہم نے کتاب دی ہے (یعنی یہود ونصاریٰ) وہ خوب جانتے ہیں کہ قرآنِ کریم (اے پیغمبر) تیرے پروردگار کی طرف سے برحق نازل کیا گیا ہے لہٰذا آپ شک کرنے والوں میں سے نہ بنیے اور تیرے پروردگار کی بات سچائی اور انصاف کے ساتھ مکمل ہو چکی ہے، اس کی باتوں (اور اس کے احکام) میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں ہے اور وہ اچھی طرح سننے والا اور جاننے والا ہے۔'' (114-115:6)

چنانچہ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ اپنی کتاب ''ارشاد الفحول'' میں فرماتے ہیں:

''جمہورِ اہل مذاہب کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اجماع کے لیے کسی سند کا ہونا ضروری ہے کیونکہ اثبات احکام کے لیے اہل اجماع کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ان کا اجماع کسی دلیل سے ثابت ہو، کیونکہ اگر ان کا اجماع کسی سند کے بغیر منعقد ہو گیا تو یہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک نئے ماخذ کا اثبات اور ایک نئی دلیل کو پیدا کرنا ہوگا جس کا کسی کو حق نہیں ہے اور یہ قطعاً غلط ہے۔'' (ص 75)

علامہ شوکانیؒ نے اجماع کے انعقاد کے لیے جس سند اور دلیل کو ضروری قرار دیا ہے اس سے ان کی مراد کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہے۔ علامہ ابن حزم ظاہری اپنی کتاب الاحکام میں فرماتے ہیں:

"عقلی طور پر بداہۃً اجماع کی تین ہی صورتیں ہوسکتی ہیں، کوئی چوتھی صورت ممکن ہی نہیں۔

ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی ایسے معاملے میں اجماع کریں جس کے بارے میں کوئی نص موجود نہ ہو۔ یہ صورت باطل ہے کیونکہ جیسا کہ گزر چکا ہے اجماع کے لیے کوئی سند ضروری ہے جس سے دلیل لی جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ لوگوں کا اجماع نص کے خلاف پر ہو جو حضورِ اکرمؐ کی وفات سے پہلے نہ منسوخ ہوئی ہو اور نہ اس میں کوئی تخصیص واقع ہوئی ہو، ایسا اجماع خالص کفر ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ لوگوں کا اجماع کسی منصوص چیز پر ہو اور یہی ہمارا سب کا قول ہے۔ یہ بدیہی تقسیم ہے۔ جس سے ہم ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں ہوسکتے اور وہ اسی طرح ہے۔ جس طرح ہم نے بیان کیا ہے تو نص کا اتباع فرض ہے خواہ اس پر لوگوں نے اجماع کیا ہو یا اس میں اختلاف کیا ہو۔ لوگوں پر اس کا اجماع کر لینا اتباع اور پیروی کے واجب ہونے میں نص کے مرتبے میں کوئی اضافہ نہیں کرتا اور لوگوں کا اس میں اختلاف کرنا اس کی پیروی اور اتباع کے واجب ہونے میں کوئی ضعف پیدا نہیں کرتا بلکہ حق بہر حال حق ہے اگرچہ اس میں لوگوں کا اختلاف ہی کیوں نہ ہو اور باطل بہر حال باطل ہے اگرچہ اس کے قائل اکثر لوگ ہوں۔" (الاحکام لابن حزم صفحہ 141 جلد 2)

گویا اجماع کی اپنی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے کیونکہ اس کے لیے کس نص (کتاب و سنت) کی سند کا ہونا ضروری ہے جس کا اتباع بصورتِ اجماع یا بصورتِ عدمِ اجماع دونوں صورتوں میں لازمی ہے۔ اجماع کی وجہ سے کسی نص کی قوتِ وجوب میں کوئی اضافہ نہیں ہوجاتا اور عدمِ اجماع یا علما کے اختلاف کے باعث نص کی قطعیت میں کوئی ضعف پیدا نہیں ہوتا۔ غرض

اجماع کی اوّل الذکر دو صورتیں یعنی کتاب وسنت کی سند کے بغیر یا ان کے خلاف تو کفر وضلالت پر مبنی ہیں۔ البتہ تیسری صورت جس کی پشت پر کتاب وسنت کی کوئی سند موجود ہو قابلِ قبول ہوسکتی ہے، مگر بقول علامہ ابن حزم اس اجماع کا اتباعِ نص کی قطعیت وحجیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، بلکہ اجماع وعدمِ اجماع یا حکمِ نص سے علما کے اختلاف کی صورت میں بھی اتباعِ نص واجب ہے۔ علامہ اباضی "صاحب طلعۃ الشمس" کہتے ہیں کہ:

"دوسری شرط یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت نبویؐ سے کوئی نص اس فیصلہ کی مخالف نہ ہو جس پر اجماع کیا گیا ہے کیونکہ کتاب اللہ اور سنت نبویؐ کی نص کے خلاف اجماع خالصتاً گمراہی ہے اور اُمت گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی۔"

مذکورہ وضاحت کے پیش نظر نص کی غیر موجودگی میں صرف اقتضائے حالات اور مصالح اُمت کے تحت کیے گئے فیصلوں کو معتبر سمجھا جائے گا اور یہ صورت بھی اس وقت قابلِ قبول ہوگی جب یہ اجماع کسی نص کے معارض نہ ہو۔

اجماعِ صحابہؓ کے سلسلے میں خلفائے راشدین کے عہد کی مجالسِ شوریٰ کے انعقاد اور ان کے متفقہ فیصلوں کو بطورِ سند پیش کیا جاتا ہے۔ خلفائے راشدین کے عہد میں اس شورائی اجماع کا ایک نمونہ استاد محمد معروف دوالیبی نے اپنے کتاب "المدخل الی علم اصول الفقه" میں اس طرح پیش کیا ہے:

غالباً مسائل اجتہادیہ اور نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد نئے واقعات جو حضراتِ صحابہؓ کو پیش آئے، ان میں اہم ترین قضیہ ان اراضی کی تقسیم کا تھا جو مجاہدین نے عراق، شام، مصر میں طاقت استعمال کر کے فتح کی تھیں۔

نص قرانی صراحۃً کہہ رہی ہے جس میں کوئی پیچیدگی نہیں کہ غنائم کا خمس بیت المال میں جمع ہوگا، جو ان مصارف میں خرچ ہوتا ہے، جنہیں قرآن کریم نے متعین کر دیا ہے۔ رہ گئے باقی چار خمس تو وہ مجاہدین

میں تقسیم ہوں گے۔ سورۂ انفال کی آیت کا مفہوم بھی یہی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی یہی تھا جیسا کہ آپ نے خیبر کی زمینوں کو مجاہدین میں تقسیم فرمادیا تھا۔ چنانچہ غانمین (مجاہدین) حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مطالبہ کیا کہ اللہ اور رسولؐ کے لیے جن کا آیت میں ذکر آیا ہے، خمس نکال کر بقیہ کو مجاہدین میں تقسیم کردیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا بعد میں آنے والے مسلمانوں کا کیا بنے گا؟ کیونکہ زمین تو مع اپنے کافر قابضوں کے تقسیم ہوچکی ہوگی اور آباؤاجداد سے ان کی اولاد کو وراثت میں منتقل ہوچکی ہوگی، یہ عقل کی بات نہیں ہے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوفؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا تو عقل کی بات کیا ہے؟ یہ زمینیں اور ان کے کافر قابضین ما افاء اللّٰہ (جو اللہ نے بطورِ غنیمت عطا فرمایا) ہی میں سے تو ہیں۔

حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا، بات وہی ہے جو تم کہہ رہے ہو، مگر میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بخدا میرے بعد کوئی شہر بھی فتح نہیں ہوگا جس میں کوئی بڑی منفعت ہوسکے، بلکہ بہت ممکن ہے وہ مسلمانوں پر بوجھ ہی بن جائے۔ جب عراق کی زمینیں مع اپنے قابضین کے تقسیم ہوچکی ہوں گی اور شام کی زمینیں بھی، تو سرحدوں کی حفاظت کیسے کی جائے گی اور یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کی کفالت کہاں سے ہوگی جو مدینہ منورہ اور عراق و شام میں پھیلے ہوں گے۔ حضرت عمرؓ پر لوگوں کا اصرار بڑھتا گیا۔ وہ کہنے لگے کہ جو مالِ غنیمت حق تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمایا تھا اسے آپ ان لوگوں کے لیے روکنا چاہتے ہیں جو موجود نہیں اور جنہوں نے جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ آپ لوگوں کے بیٹوں اور پوتوں کے لیے رکھ رہے ہیں جن کا کوئی وجود نہیں۔ مگر حضرت عمرؓ اپنی رائے پر مُصر رہے تو انہوں نے کہا، اچھا آپ کچھ لوگوں سے مشورہ تو کرلیجیے۔ حضرت عمرؓ نے

مہاجرین اوّلین سے مشورہ کیا تو وہ بھی مختلف الرائے تھے۔ اُن میں کچھ لوگ تو حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوفؓ کے ہم خیال تھے کہ لوگوں کو اُن کے حقوق کے مطابق زمین تقسیم کردیا جائے، لیکن حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ حضرت عمرؓ کی رائے سے متفق تھے۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ نے انصارِ مدینہ کے قبیلہ اوس وخزرج سے پانچ پانچ آدمیوں کو بُلایا اور اُن کے سامنے اپنے خیالات پیش کیے اور فرمایا:

”آپ نے لوگوں کی باتیں سُن لیں جن کا خیال یہ ہے کہ میں ان کے حقوق کے سلسلہ میں ان پر زیادتی کررہا ہوں اور میں اس سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں ظلم کا ارتکاب کروں۔ اگر میں نے ان پر کچھ بھی ظلم کیا کہ ان کا حق دوسروں کو دے دیا تو مجھ سے زیادہ بدبخت کون ہوگا۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ سرزمین کسریٰ کے بعد کچھ باقی نہیں رہے گا، جسے فتح کیا جائے۔ حق تعالیٰ نے ہمیں ان کے اموال، ان کی زمینیں، ان کے باشندے، سب مالِ غنیمت میں عطا فرمائے تو جو ان کے اموالِ منقولہ غنیمت میں حاصل ہوئے تھے میں نے ان کو ان کے حق داروں میں تقسیم کردیا اور خمس میں نے نکال لیا اور اُسے اس کے مقررہ مصارف میں خرچ کردیا اور کچھ خرچ کررہا ہوں اور میری رائے یہ ہے کہ زمینوں اور اس کے باشندوں کو تقسیم نہ کروں بلکہ روک لوں اور ان کی زمینوں پر خراج عائد کردوں اور ان کی گردنوں پر جزیہ لگادوں جو وہ مسلمانوں کو بطور فے کے ادا کرتے رہیں۔ جو مجاہدین اور اُن کی اولاد کے کام آئے اور ان کے بھی کام آئے جو اُن کے بعد آئیں گے۔ مجھے بتاؤ یہ سرحدیں ہیں، ان کے لیے فوجوں کی ضرورت ہے جو اُن کی حفاظت کریں۔ ان بڑے بڑے شہروں، شام، جزیرہ، کوفہ، بصرہ اور مصر کو دیکھو جن کے لیے ضروری

ہے کہ وہاں ہمہ وقت فوجیں رکھی جائیں، ان کو تنخواہیں دی جائیں، تو ان کو کہاں سے دیا جائے گا، جب زمینیں اور ان کے باشندے تقسیم کر دیے جائیں گے۔" (المدخل الی علم اصول الفقہ، ص 95-93)

علامہ دوالیبی مزید تحریر فرماتے ہیں کہ:

"حضرت عمرؓ برابر مشورے کرتے رہے اور بحث کرتے رہے۔ لوگ ظواہر نصوص سے استدلال کرتے تھے اور حضرت عمرؓ مفتوحہ اراضی اور ان کے باشندوں کو تقسیم نہ کرنے کے لیے مسلمانوں کی مصلحت سے استدلال کرتے تھے اور گویا حضرت عمرؓ اور حضرت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل میں جو آپؐ نے خیبر کی زمینوں کے متعلق فرمایا تھا اور عراق، مصر اور شام کی زمینوں کے درمیان فرق کر رہے تھے کہ اگر یہاں بھی آنحضرتؐ کے عمل کے مطابق عمل کیا گیا تو مسلمانوں کی مصلحت کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے اور وہ ان دونوں طرز ہائے عمل میں کوئی تضاد نہیں سمجھ رہے تھے۔ برابر یہی بحث مباحثہ جاری رہا۔ آخر حضرت عمرؓ یہ کہتے ہوئے تشریف لائے کہ مجھے ان لوگوں کے خلاف سورۂ حشر کی آیات میں دلیل مل گئی ہے، جہاں حق تعالیٰ نے ان سب لوگوں کو شمار کرا دیا ہے جو مالِ غنیمت کے مستحق ہوتے ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اور جو کچھ اللہ اپنے رسولؐ کو بستیوں کے کافروں سے دلوادے سو وہ بھی اللہ کا حق ہے اور رسولؐ کا اور آپؐ کے قرابت داروں کا، اور یتیموں کا، مسکینوں اور مسافروں کا حق ہے تاکہ یہ مال تمہارے دولت مندوں کے قبضے میں نہ آجائے۔" (7:59)

اس کے بعد فرمایا:

"اور حاجت مند مہاجرین کا بالخصوص حق ہے جو اپنے گھروں

سے زبردستی نکالے گئے۔" (8:59)

پھر فرمایا:

"اور اُن کا بھی حق ہے جو دارالسلام (مدینہ) میں ان (مہاجرین) کے (آنے کے) قبل سے قرار پکڑے ہوئے ہیں (یعنی انصارِ مدینہ)۔"

حتیٰ کہ آیت کا خاتمہ ان الفاظ پر فرمایا:

"اور ان لوگوں کا بھی اس مالِ فَے میں حق جو اُن کے بعد آئے۔" (10:59)

حضرت عمرؓ نے کہا میرا نظریہ یہ ہے کہ آیت ساری کی ساری مخلوق کے لیے عام ہے حتیٰ کہ وہ چرواہا بھی اس میں شامل ہے جو مقامِ کداء میں بکریاں چرا رہا ہے اور ان لوگوں سے کہا کہ تم چاہتے ہو کہ آخر میں جو لوگ آئیں گے ان کے لیے کچھ بھی نہ رہے۔ آخر تمہارے بعد آنے والوں کا کیا بنے گا! اگر آخر میں آنے والوں کا خیال نہ ہوتا تو جو آبادی بھی فتح ہوتی، میں اسے اسی طرح تقسیم کر دیتا جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کو تقسیم کر دیا تھا۔" (المدخل الی علم اصول الفقہ ص 226-225)

علامہ محمد معروف دوالیبی کی کتاب سے یہ طویل اقتباسات اس لیے نقل کیے گئے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ خلفائے راشدین کے دور میں شورائی اجماع کی کیا صورت ہوتی تھی۔ حضرت عمرؓ اور ان کے ہم خیال اصحاب یا ان کے مخالفین میں سے کسی ایک شخص نے اپنی ذاتی رائے منوانے پر اصرار نہیں کیا بلکہ دونوں طرف سے کتاب وسنت سے استدلال کیا گیا اور بالآخر آخری فیصلہ بھی سورۂ حشر کی آیاتِ مبارکہ پر ہوا جسے نص قطعی کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ اس فیصلے سے ایک دوسری اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ دراصل احکامِ شریعت دو قسم کے ہیں، ایک عبادات سے متعلق ہیں جن کا معیار عقل نہیں ہوسکتی اور بقول ڈاکٹر صبحی محمصانی بحوالہ الموافقات

ص300، ج2:

"اگر قرآن وسنت کا کوئی حکم دین وعبادت سے متعلق ہے تو وہ اس وقت تک باقی رہے گا جب تک زمین زمین ہے اور آسمان آسمان ہے۔ کیونکہ اصولِ دین اور توحید وایمان کے ضابطے حقیقی ہیں اور ناقابلِ تبدیل اور ازلی وابدی ہیں۔ ان تمام ضابطوں میں حکمِ نص کی اطاعت لازمی ہے۔"

شریعت کے باقی احکام دنیوی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں جن میں تغیر حالات اور اختلافات زمانہ کے اعتبار سے ضرورتاً تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ "تغیر الاحکام بتغیر الازمنہ" ہماری فقہ کا ایک مستقل باب ہے جس کے تحت زمان ومکان اور حالات وعادات کی تبدیلی سے احکام بدل جاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے بعض فیصلے عہد نبویؐ کے فیصلوں سے تبدیل شدہ صورتوں میں ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

1- عراق، شام اور مصر کی زمینوں کو مجاہدین میں تقسیم نہ کرنا۔

2- مؤلفۃ القلوب کے عطایا کو بند کردینا۔

3- قحط سالی کے زمانہ میں قطع ید کی سزا کو موقوف کردینا۔

4- مفقود کی بیوی کے لیے یہ حکم کہ شوہر کی گمشدگی کے چار سال بعد عدت گزار کر نکاحِ ثانی کرسکتی ہے۔

5- بیک وقت دی ہوئی تین طلاقوں کو ایک ساتھ نافذ کردینا۔

6- تجارتی گھوڑوں پر زکوۃ عائد کرنا وغیرہ۔

یہ ایسی واضح مثالیں ہیں جن میں تبدیلیٔ حالات اور اختلافِ زمانہ کو مدنظر رکھتے ہوئے مصالحِ اُمت کے پیشِ نظر عہد نبویؐ کے فیصلوں سے مختلف فیصلے کیے گئے مگر اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ حضرت عمرؓ نے خدانخواستہ کتاب وسنت کی نصوص کو باطل یا معطل کردیا تھا، البتہ انہوں نے علت نص پر غور فرمایا اور ظاہر نص کا اتباع نہیں کیا بلکہ تبدیل شدہ حالات کی روشنی میں دوسری نصوص کے دلائل سے استدلال کرتے ہوئے مصلحت عامہ کو پیشِ نظر رکھا۔ چنانچہ خیبر کی زمینوں

کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ عمل بھی کہ "خمس نکال کر تمام کی تمام زمینیں مجاہدین میں تقسیم کردی گئیں" سورۂ انفال کی آیت وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ کے تحت مصلحت وقت مطابق تھا اور عراق وشام اور مصر کی زمینوں کے بارے میں حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ بھی کہ "انہیں بعد میں آنے والوں کے لیے روک دیا جائے" سورۂ حشر کی آیت وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ کے عین مطابق تھا کیونکہ اس وقت کے حالات اور مصالح اُمت کا تقاضا یہی تھا کہ عہد نبوی کے فیصلے سے یکسر مختلف فیصلہ کیا جائے۔ مگر جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں یہ مختلف فیصلہ بھی نص قرآنی پر ہی مبنی تھا، تنہا حضرت عمرؓ کی رائے کا کوئی انفرادی فیصلہ نہ تھا۔

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوگئی ہے کہ شرعی مآخذ میں اصل اہمیت قرآن وسنت ہی کو حاصل ہے اور بذاتِ خود اجماع کی کوئی حیثیت نہیں ہے کیونکہ اجماع وہی معتبر ہوسکتا ہے جس کی پشت پر کوئی نص موجود ہو۔ کیونکہ اتباعِ نص بصورتِ اجماع وعدم اجماع دونوں صورتوں میں لازم ہے۔

غرض اجماع کی مبینہ تین صورتوں میں علامہ ابن حزمؒ کے نزدیک یہی ایک صورت معتبر ہے جس کی بجائے خود کوئی حیثیت نہیں ہے۔ باقی دونوں صورتیں باطل یا خالصۃً کفر ہیں۔ البتہ دیگر علمائے اُمت کے نزدیک نص کی غیرموجودگی میں صرف اقتضائے حالات اور مصالح اُمت کے تحت کیے گئے فیصلوں کو معتبر سمجھا جائے گا، بشرطیکہ وہ کسی نص کے معارض نہ ہوں۔

جب اجماع کی یہ حیثیت کہ وہ صرف اس صورت میں معتبر ہوسکتا ہے جب

1- اس کی پشت پر کوئی نص موجود ہو۔

2- وہ کتاب وسنت کے خلاف نہ ہو۔

3- نص کی غیرموجودگی میں اقتضائے حالات اور مصالح اُمت کو پیشِ نظر رکھ کر اس کا فیصلہ کیا گیا ہو۔

اور ان تین صورتوں کے علاوہ اجماع کی کوئی چوتھی صورت معتبر نہیں، تو بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علما وفقہا کے انفرادی قیاسات واجتہادات یا اقوالِ ائمہ کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔

اجماع یا قیاس واجتہاد کی ضرورت اسی وقت پیش آتی ہے جب کتاب وسنت میں کوئی واضح حکم موجود نہ ہوتو اس صورت میں یقیناً ہم ان اذارات کی طرف رجوع کریں گے اور ان سے بروقت مناسب راہنمائی بھی حاصل کی جائے گی۔ (از تالیف مؤلف ''نفاذِ اسلام اور درپیش مسائل'' ص44 تا53)

اسی کتاب کے حرفِ اوّل میں اس موضوع پر ہم نے اپنا جو اصولی موقف بیان کیا ہے، اس کے چند اہم اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں:

''ہمارے نزدیک احکام وقوانین کا شرعی ماخذِ اوّل قرآن ہے، ماخذِ دوم سنت رسولؐ اور تیسرا چوتھا ماخذ اجماع وقیاس ہے۔ شرعی ماخذوں کی حیثیات کے مذکورہ تعین اور مقررہ ترتیب کا عقلی اور منطقی تقاضا تو یہ ہونا چاہیے کہ جو احکام واضح طور پر ماخذِ اوّل (قرآن) سے ثابت ہیں ان میں کسی ادنیٰ اور کم تر درجے کے ماخذ سے کوئی تبدیلی یا تنسیخ عمل میں نہ لائی جائے لیکن عملی صورت یہ ہے کہ ایک اعلیٰ ماخذ سے ثابت شدہ احکام میں اس سے کم تر درجے کے ماخذوں سے نہ صرف ترمیم کر لی جاتی ہے بلکہ انہیں منسوخ کرنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی جاتی اور اس طرح ان ماخذوں کی مسلّمہ ترتیب اور ان کی حیثیات کا تعین خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اعلیٰ ماخذ سے ثابت شدہ احکام میں کسی کم تر درجے کے ماخذ سے کوئی وضاحت یا اضافہ اسی صورت میں درست ہو سکتا ہے جب ان میں کوئی بنیادی حکم تو موجود ہو لیکن اس کی ضروری تفاصیل بیان نہ کی گئی ہوں۔ جیسے نماز اور زکوٰۃ کا حکم تو قرآن میں جابجا مذکور ہے مگر ان کی تفاصیل بیان نہیں کی گئیں۔''

''مسئلے کا درست حل یہی ہے کہ ہر ماخذ کو اس کے اصل مقام پر رکھا جائے۔ چنانچہ جہاں ہمیں اپنے دوسرے ماخذ سنت رسولؐ سے راہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئے اور وہاں سے مطلوبہ رہنمائی

مکمل طور پر حاصل ہو جائے تو اب تیسرے یا چوتھے ماخذوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ ہم ان کی طرف اسی وقت رجوع کریں گے جب ہمارے مسائل کتاب وسنت سے حل نہ ہو سکیں گے۔ اگر ہر مآخذ سے مناسب راہنمائی اس کے اپنے حقیقی مقام سے حاصل کی جائے اور ایک ماخذ کو دوسرے ماخذ کی جگہ استعمال نہ کیا جائے تو اس اصول کو عملی طور پر اختیار کرنے سے ہمارے قانونی مسائل کے بیشتر تضادات بآسانی ختم ہو سکتے ہیں۔''

''اجماع وقیاس کی تشریحی اور قانونی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ نصِ قطعی (قرآن وسنت) کی غیر موجودگی میں یا اس صورت میں کہ ان میں اصل حکم تو موجود ہو لیکن اس کی عملی صورتوں کی وضاحت پیش نہ کی گئی ہو۔ ان سے بروقت ضرورت استفادہ کیا جا سکتا ہے لیکن قرآن وسنت کے واضح احکام کی موجودگی میں ان سے رہنمائی حاصل کرنے کی نہ ضرورت ہے نہ کوئی اہمیت۔ جس طرح کتاب وسنت کے معروف اور اوامر ونواہی کے سلسلے میں یہ کہنا کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی فرضیت اور قتل، چوری، زنا اور شراب کی حرمت پر اجماعِ اُمت ہو گیا ہے، ایک بے معنی اور لغوی بات ہے۔ بعینہٖ ان احکام وقوانین کے سلسلے میں جن کی تمام ضروری تفاصیل بلکہ جزئیات تک قرآن میں بیان کی جا چکی ہیں ان میں کمی بیشی یا ترمیم وتنسیخ کے لیے اجماعِ اُمت کا سہارا لینا اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے۔''

''اسی طرح یہ اصول کہ اجماع وتعامل اُمت کی تائید سے کوئی کمزور اور ضعیف روایت بھی حجت شرعی اور سندِ قوی کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ عام حالات میں تو درست ہو سکتا ہے لیکن کسی نصِ قطعی کی موجودگی میں ایسے کمزور سہاروں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔'' (ایضاً 2، 3، 4)

مذکورہ بالا تصریحات سے کتاب و سنت کی روشنی میں بہ دلائلِ عقلی و نقلی بداہۃً ثابت ہو گیا کہ جس اجماع کی بار بار دہائی دی جاتی ہے اور کسی اَمر میں اس سے اظہارِ اختلاف کرنے والے کو نہ صرف گردن زدنی بلکہ دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا جاتا ہے، بجائے خود اس کی اپنی حیثیت کیا ہے۔

تعبیر و تفسیر کا اختلاف

امورِ علمی میں خیر القرون (عہد صحابہ و تابعین) سے لے کر علمائے متقدمین تک تعبیر و تفسیر کے اختلافات موجود رہے ہیں، جن کی بیشتر مثالیں پیش کی جا چکی ہیں۔ ان میں اہم ترین مثالیں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں مجاہدین میں خیبر کی زمینوں کے تقسیم کرنے اور حضرت عمرؓ کے سرزمین عراق کی زمینوں کے روک لینے کی ہیں۔ جن میں بظاہر کھلا تضاد و اختلاف نظر آتا ہے لیکن فی الحقیقت نہ کوئی اختلاف ہے اور نہ تضاد۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ بھی ''سورۂ انفال'' کی نصِ قطعی کی روشنی مین کیا گیا تھا اور یہ فیصلہ اس وقت کے حالات اور مصالح اُمت کے عین مطابق تھا۔ اسی طرح عراق کی زمینوں کو آنے والوں کے لیے روک لینے کے لیے حضرت عمرؓ کا فیصلہ بھی اس وقت تسلیم کیا گیا جب انہوں نے ''سورۂ حشر'' کی آیات سے استدلال پیش کیا اور ان دونوں فیصلوں کو جو بظاہر مختلف نظر آتے ہیں تغیر حالات ازمنہ کے اختلاف سے تعبیر کر لیا گیا۔ جب کتاب اللہ کی نصوص قطعی کی موجودگی میں اختلاف کے پہلو نکل سکتے ہیں تو علمائے متاخرین کے کسی مزعومہ اور خود ساختہ عقیدے سے اظہار اختلاف کو جو علمی دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہو کیوں برداشت نہیں کیا جا سکتا؟ ہم نے دوسری مثال میں قرآن کے شارح اوّل حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ تفسیر بھی پیش کر دی ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے (صحابہؓ و تابعینؒ) عام مفسرین سے ہٹ کر ''اِنّی متوفیک'' کی تفسیر ''ای ممیتک'' سے کی ہے۔ لیکن حضرات صحابہؓ میں ان کی اس تعبیر و تغیر سے اختلاف کرنے والے مفسرین کو یہ خیال تک نہ گزرا کہ ان کے خلاف کوئی فتویٰ عائد کریں۔

ایسے تصورات جو قرآن و سنت کی کسی نص قطعی سے ثابت نہ ہوں بلکہ کسی دور کے علما نے انہیں اسلام کے مسلمہ عقائد میں شامل کر لیا ہو۔ مزعومہ اور خود ساختہ تو قرار دیے جا سکتے ہیں

لیکن انہیں اسلام کے بنیادی عقائد میں جن کی تفصیل بوضاحت پیش کی جا چکی ہے، ہرگز شامل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صورتِ حال کیوں پیش آئی؟ یہ صورتِ حال اس لیے پیش آئی کہ آئمہ اربعہ کے بعد قیاس و اجتہاد کا دروازہ تو مستقل طور پر بند کر دیا گیا اور علمائے متاخرین مقلد محض اور لکیر کے فقیر بن کر رہ گئے۔ شاید علامہ اقبالؒ نے انہیں حضرات کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ:

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

ورنہ ہم بتا چکے ہیں کہ خیر القرون سے لے کر علمائے متقدمین تک تعبیر و تشریح کا اختلاف موجود رہا ہے۔ اگر یہ اختلاف موجود نہ ہوتا تو ملت اسلامیہ کے چار مسلمہ مسالک (مالکی، حنفی، حنبلی، شافعی) کیوں اور کیسے وجود میں آتے۔ ائمہ اربعہ کے یہ تعبیری اختلافات ہی تو تھے جس پر چار مسالک فکر کی بنیاد قائم ہوئی۔ لیکن ائمہ اربعہ میں سے کسی امام نے بھی دوسرے امام کے مسلک کو باطل قرار نہیں دیا بلکہ روایاتِ حدیث میں سے کسی روایت کو قبول اور دوسری سے صَرفِ نظر کرنے کی صورت میں ہر مسلک کو برحق تسلیم کیا ہے اور ان دونوں صورتوں کو راجح اور مرجوح قرار دیا، جبکہ ہم نے زیرِ نظر موضوع میں زیادہ تر انحصار نصوصِ قرآنی پر کیا ہے یا کسی سنت ثابتہ سے اپنے نقطۂ نظر کی تصدیق و تائید پیش کی ہے۔

منظور ہے وضاحتِ احوالِ واقعی

زیرِ نظر موضوع پر اصل کتاب میں ہم نے جو دلائلِ عقلی و نقلی پیش کیے ہیں ان کے سلسلے میں بتایا جا چکا ہے کہ یہ موضوع ایک مدت تک قلب و نظر کے نہفتہ گوشوں میں کھٹکتا رہا، مگر اس پر اظہارِ خیال کی نوبت نہ آ سکی۔ پھر جب پہلے سفرِ حج کا ارادہ کیا تو ایک مخلص دوست کی فرمائش پر کعبۃ اللہ میں ربِّ کریم کے حضور خلوصِ قلب کے ساتھ یہ دُعا پیش کی کہ ملت اسلامیہ کے اختلافی و نزاعی مسائل بالخصوص نزولِ مسیح اور ظہورِ مہدی کے مزعومہ عقائد میں ہمارے قلب کو یکسوئی عطا فرما۔ چنانچہ سفرِ حج سے واپسی پر اس بندۂ پُر تقصیر نے دورانِ سفر ہی میں اسلام آباد واپس آ کر پہلی فرصت میں اس موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں یا مضامین سے کوئی ''اعتنا'' نہ کرتے ہوئے صرف اور صرف قرآنی آیات کو پیشِ نظر رکھا اور مضمون سپردِ قلم کر دیا۔ یہ تمام تحریری کام بحمد اللہ دو ہفتے کی

قلیل مدت میں مکمل ہوگیا۔ یہ رسالہ بھی بالکل اسی انداز پر یعنی متعلقہ موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں یا مضامین کی ورق گردانی کیے بغیر مکمل ہوا۔ جس طرح والدِ گرامی حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے کسی سفر کے دوران جب ان کی نظر سے امیر جماعت اسلامی مولانا مودودی صاحب کی کتاب ''خلافت وملوکیت'' گزری تو انہوں نے اس کا جواب ''برأتِ عثمانؓ'' کے نام سے تحریر فرمایا جسے بعد میں احباب نے کتابی صورت میں شائع کر دیا اور اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ جونہی کوئی ایڈیشن شائع ہوتا ہے، چند ہفتوں یا مہینوں میں نایاب ہو جاتا ہے۔ مولانا عثمانی مرحومؒ کا یہ مضمون بھی کتبِ حوالہ سے اعتنا کیے بغیر قلم برداشتہ لکھا گیا تھا اور اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ اس میں جو بات بھی کہی گئی، اتنی جامعیت اور قطعیت کے ساتھ کہی گئی کہ جس کے خلاف کچھ لکھنے کی جرأت مولانا مودودی صاحبؒ بھی نہ کر سکے۔ البتہ جماعت اسلامی کے ایک نووار دِ صحافت نے اپنے ماہنامے کا ایک پورا شمارا اس پر بطورِ تبصرہ شائع کیا، جس کا جواب راقم الحروف نے ''تذکرۂ یاراں'' کے نام سے ہفت روزہ شہاب میں بالاقساط شائع کرایا جو بعد میں اسی نام سے کتابی شکل میں ''مجلس خدامِ صحابہؓ'' ملتان نے شائع کیا۔ علمی حلقوں میں ''تذکرۂ یاراں'' بھی بہت پسند کیا گیا اور اس کی مانگ اب تک جاری ہے۔ مگر اس کی دوبارہ اشاعت کی ضرورت اس لیے محسوس نہیں کی گئی کہ اس موضوع پر ہم نے اپنی ضخیم کتاب ''سیّدنا عثمان ذوالنورین'' میں تفصیل کے ساتھ اظہارِ خیال کر دیا ہے۔ اہل علم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ والدِ گرامی حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانیؒ ''مشاجرات صحابہؓ'' کے سلسلہ میں کسی فریق کو حق پر یا دوسرے فریق کو باطل رَوش پر تسلیم نہ کرتے تھے بلکہ امام اعظمؒ کے نظریہ ارجاء کے قائل تھے کہ کسی فریق کے حق و ناحق پر ہونے کا فیصلہ حق تعالیٰ پر چھوڑ دیا جائے اور خود اس پر سکوت اختیار کیا جائے۔

''تذکرۂ یاراں بر تبصرۂ فاران'' کی اشاعت تک کم وبیش ہم بھی اسی نظریہ پر قائم تھے۔ لیکن جب شہادتِ عثمانؓ کی افواہ کے ضمن میں بیعت رضوان کی قرآنی آیات کا بغور مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس بارے میں حضرت معاویہؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور ان کے ہم نواؤں کا مؤقف ہی ''اقرب الی الصواب'' اور قرآنی آیات کے مضمون کے عین مطابق تھا۔

بیعت رضوان کے سلسلہ میں نازل شدہ آیات کے یہ فقرات بطورِ خاص قابل توجہ ہیں: فَمَنْ نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ○ (تو جو اس عہد کو توڑے گا تو اس کی عہد شکنی کا وبال خود اس کی ذات پر پڑے گا اور جو اپنے عہد کو پورا کرے گا، جو اس نے اللہ سے کیا ہے تو اللہ اُسے بڑا اجر عطا فرمائے گا)۔

یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ''واقعۂ شہادتِ عثمانؓ'' کی خبر جو محض افواہ تھی تو ایسی افواہ پر جس کا حقیقتِ حال سے کوئی تعلق نہ ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر تمام مسلمانوں سے بیعت لینا اور اس بیعت کو بیعتِ رضوان قرار دینا اور اس پر حق تعالیٰ کا اظہارِ خوشنودی بڑا معنی خیز ہے؟ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حقیقتِ حال کا پورا علم نہ تھا تو اس علیم وخبیر ذات کو تو اس کا پورا پورا علم تھا کہ حضرت عثمانؓ بخیر و عافیت واپس آ جائیں گے۔ اس صورت میں خود بیعتِ رضوان کا انعقاد اور حق تعالیٰ کی طرف سے ایسے شاندار الفاظ میں اظہارِ خوشنودی، پھر عہد پر قائم رہنے والوں کے حق میں اجرِ عظیم کا وعدہ اور عہد سے روگردانی کرنے والوں کے لیے یہ سخت وعید اور انتباہ کہ اس عہد شکنی کا وبال ان کی گردنوں پر ہوگا۔ یہ امور اہلِ علم وفکر کے لیے غور طلب ہیں۔

1- بیعتِ رضوان جس میں تمام مسلمانوں نے قصاص عثمانؓ کے لیے رسولِ اکرمؐ کے دستِ مبارک پر جاں نثاری کی بیعت کی تھی اور عہد کیا تھا کہ اپنی جانیں قربان کر دیں گے مگر قصاصِ عثمانؓ سے روگردانی نہ کریں گے۔ اسی لیے یہ بیعت حق تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی کا سبب بنی، جس سے راضی ہو کر حق تعالیٰ نے بے سروسامان مسلمانوں کو (جو اس وقت مسلح بھی نہ تھے کفار کے مقابلے میں) سکون وطمانیت کی دولت سے نوازا اور ایک قریبی فتح ''فتح مکّہ'' کی خوشخبری سنائی۔

2- بیعتِ رضوان کے موقع پر جو عہد و پیمان لیا گیا تھا اس کا تعلق اُس وقت کے واقعات سے بالکل نہ تھا۔ کیونکہ اس وقت نہ تو اس عہد کے پورا کرنے کا واقعہ پیش آیا، نہ عہد شکنی کی نوبت آئی۔ لہٰذا یہ بیعت اور مسلمانوں کی طرف جاں نثاری کا عہد و پیمان آئندہ پیش آنے والے واقعہ شہادتِ عثمانؓ سے تھا کہ جب یہ حادثۂ فاجعہ پیش آئے گا

تو جولوگ اپنے کیے ہوئے عہد پر قائم رہیں گے وہ اجرِ عظیم کے مستحق ہوں گے اور جو لوگ اس عہد کو پورا کرنے میں کمزوری دکھائیں گے، اس سے پہلو تہی کریں گے تو اس کا وبال خود ان پر پڑے گا اور وہ اس کے نتائج بد سے کسی طرح نہ بچ سکیں گے۔

3- تیسری اہم بات یہ ہے کہ بیعتِ رضوان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قصاصِ عثمانؓ کے لیے حق تعالیٰ کی خوشنودی کے ساتھ اپنے دستِ مبارکہ پر جو "حکماً اور نیابتاً اللہ ہی کا ہاتھ تھا" مقامِ حدیبیہ پر موجود تمام صحابۂ کرامؓ سے جاں نثاری کا عہد لیا تھا۔ اس کی رُو سے حضرت عثمانؓ کا قصاص ہر شریکِ بیعت مسلمان کے علاوہ پوری اُمتِ مسلمہ پر فرض ہو گیا تھا۔ جس کی فرضیت اس بیعت کے وقت آپؐ نے یہ کہہ کر کہ "عثمانؓ کے خون کا قصاص لینا فرض ہے" ظاہر فرمادی تھی۔ کیونکہ یہ بیعت انفرادی بیعت نہ تھی بلکہ یہ بیعت مسلمانوں نے من حیث القوم اور من حیث الجماعة کی تھی۔ اس لیے شہادتِ عثمانؓ کے بعد جو لوگ حضرت طلحہ اور زبیرؓ، اُم المومنین حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ قصاصِ عثمانؓ کا مطالبہ کر رہے تھے وہ نہ صرف حق پر تھے کیونکہ کُتِبَ عَلَیْکُمُ القصاص فِی القَتلٰی کی صریح نص کے علاوہ بیعتِ رضوان کی مذکورہ آیات کی رُو سے بھی قصاصِ عثمانؓ کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینا پوری اُمتِ مسلمہ پر فرض ہو گیا تھا۔ لہٰذا ان حضرات کا اقدام نصوصِ قرآنی کے عین مطابق تھا اس لیے اب ہمارا علمی موقف یہ ہے کہ ان حضرات کا موقف درست اور اقرب الی الصواب تھا۔

ہم یہ حقیقت واضح کر چکے ہیں کہ حیاتِ مسیح، نزولِ مسیح اور ظہورِ مہدی کے عقائد قرآن اور حدیث کی معتبر کتب صحیحین (بخاری، مسلم) سے بھی ثابت نہیں کیے جاسکتے بلکہ یہ ایسے عقائد ہیں کہ بقول مولانا عبید اللہ سندھیؒ "علوم اسلامیہ کے تمام شعبوں کے مرجع و منبع قرآن عظیم" میں کوئی آیت ایسی نہیں جو صراحتاً اس بات پر دلالت کرے کہ عیسیٰ علیہ السلام بقیدِ حیات ہیں اور نازل ہوں گے اور یہ یعنی "اخذ کردہ دلائل اور تفسیرات" شک و شبہ سے خالی نہیں ہیں اور جو چیز اس درجہ کی ہو کیسے ممکن ہے کہ ہم اس کو عقیدۂ اسلامیہ کی بنیاد بنا ڈالیں۔ (ترجمہ تفسیر الہام الرحمٰن

ص 149 الجزء الثانی) اور جو عقیدہ محض اخذ کردہ دلائل و استنباطات پر مبنی ہو اور اسے خود ساختہ طور پر اسلام کا بنیادی عقیدہ بنا دیا گیا ہو تو ایسے مزعومہ عقیدے کو نہ تو بنیادی عقیدہ قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ مسلّمہ عقیدہ۔

زیرِ نظر مقالہ کی اشاعت کے سلسلے میں جب راقم الحروف راولپنڈی میں قیام پذیر تھا تو حسن اتفاق سے دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل مولانا حکیم نیاز احمد صاحب مؤلفِ روایت افک اور محقق کشف الغمه عن عمر ام الامه راولپنڈی تشریف لائے ہوئے تھے۔ دورانِ ملاقات میں میں نے زیرِ نظر مسودے کی ایک نقل برائے مطالعہ اُن کی خدمت میں پیش کی تو ضعفِ بصارت کے باعث خود تو نہ پڑھ سکے لیکن حرفاً حرفاً پڑھوا کر سنا اور بہت پسند فرمایا۔ بعد مطالعہ مولانا نے چیں بجبیں ہو کر دریافت فرمایا کہ اس مسودے پر کسی سے تنقید کروانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟ میں نے عرض کیا "لِیَطْمَئِنَّ قَلبِی" پھر دریافت فرمایا کہ کس سے تنقیدات کروائی ہیں۔ میں نے مجبوراً مولانا کو اپنے ناقد صاحب کا نام بتایا۔ مولانا پھر برہم ہوئے اور فرمایا کہ تم نے حماقت پر حماقت کی ہے۔ اس سے مولانا محترم کا منشا کیا تھا، اسے تو وہ خود ہی بہتر جانتے ہیں۔

اختلافی مسائل پر حضرت تھانویؒ کی محتاط روش

علمائے متقدمین کی طرح اس دَور کی نامور شخصیت حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی اختلافی مسائل پر محتاط روش اہلِ علم کے لیے قابلِ تقلید ہے۔

مولانا تھانویؒ کی وہ دو مجلسیں مجھے آج تک یاد ہیں جن میں سے ایک مجلس میں کسی معترض نے عرض کیا کہ حضرت "احمد رضا خان" آپ کو بہت بُرا بھلا کہتے ہیں، مولانا تھانوی نے بَر جستہ فرمایا "مولانا احمد رضا خاں صاحب" کہو۔ پھر ارشاد فرمایا کہ وہ مجھے اگر بُرا بھلا کہتے ہیں تو شاید وہ میرے اندر عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حبِ رسولؐ کی کمی محسوس کرتے ہوں گے اور یہ کمی تو مجھ میں بھی یقیناً موجود ہے۔ کیونکہ کوئی شخص بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اُس نے حبِ رسولؐ کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔

ایک دوسری مجلس میں کسی صاحب نے سر سیّد احمد خان کے عقائد کے بارے میں سوال کیا کہ وہ اسلام کے بہت سے مسلّمہ عقائد کا انکار کرتے ہیں۔ حضرت تھانویؒ نے ارشاد فرمایا کہ

سر سیّد احمد خان نہ تو دینی علوم کی تکمیل کر سکے تھے اور نہ جدید علوم پر کما حقہ عبور رکھتے تھے۔ سرکاری ملازمت کے دوران انہیں انگریز افسروں کا قرب حاصل رہا ہے اور مغرب کی طرف سے اسلام پر اعتراضات سامنے آئے تو اُن کا جواب سر سیّد احمد خان "عدمِ تکمیل دین" کے باعث نہ دے سکے تو انہوں نے ایسے عقائد ہی کا انکار کر دیا جو بڑی شدت سے مغرب اور عیسائیت کی جانب سے اسلام پر وار کیے جا رہے تھے۔ میرے خیال میں ان کے خلوصِ نیت پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ انہوں نے جو کچھ کیا، اسلام کے دفاع کی نیت سے کیا اور یہ بات بھی میرے علم میں ہے کہ جب مولانا تھانویؒ کانپور میں مسند درس پر جلوہ افروز ہوئے تھے تو اس وقت سر سیّد احمد خان صاحب پختہ عمر کے ایک سن رسیدہ بزرگ تھے، انہیں اصلاحِ عقائد کے سلسلہ میں ایک نہایت مخلصانہ اور ہمدردانہ خط بھی لکھا تھا جو شاید حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے ایما پر تحریر کیا تھا۔

علمی اور سیاسی اختلافات کے باوجود اہلِ علم کے بارے میں میرے والد محترم حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے حسن ظن کا یہ واقعہ بھی اربابِ علم کے لیے قابلِ توجہ ہے کہ ایک روز میں نے تنہائی میں مولانا امین احسن اصلاحی کی علمی حیثیت کے بارے میں دریافت کیا تو جواب میں حسبِ عادت مسکرا کر فرمایا کہ میری نظر میں پوری جماعت اسلامی میں اگر کوئی واقعی عالمِ دین ہے تو وہ مولانا امین احسن اصلاحی ہیں۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں نے کچھ عرصہ بحیثیت ممبر لا کمیشن ان کے ساتھ کام کیا ہے۔

عقیدۂ ختم نبوت اور نزولِ مسیح علیہ السلام

(قرآن کی روشنی میں)

از قمر احمد عثمانی

ہمارے مذہبی عقائد میں حیاتِ مسیحؑ اور نزولِ مسیحؑ کا عقیدہ بھی من جملہ دیگر عقائد کی طرح اسلام کے بنیادی عقائد میں شمار کیا جاتا ہے اور ان کے نہ ماننے والوں کو دائرۂ اسلام ہی سے خارج کر دیا جاتا ہے، جبکہ نزولِ مسیحؑ کا عقیدہ تو قرآن کریم کی کسی آیت سے اشارتاً بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا، البتہ حیاتِ مسیحؑ کے بارے میں قرآن کریم کی بعض آیات کی تعبیرات سے اس عقیدے کے اثبات کے لیے کچھ قرائن و شواہد پیدا کر لیے گئے ہیں۔ اس لیے قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں جو تفاصیل پیش کی گئی ہیں ان پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ ان کی روشنی میں کوئی واضح رائے قائم کی جا سکے۔

سورۂ نساء میں ارشاد ہے:

وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ج وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ط مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ج وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ہ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ہ (نساء)

ان کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیحؑ ابن مریمؑ کو (جو اللہ کے رسول ہیں) قتل کر دیا، حالانکہ انہوں نے نہ ان کو قتل کیا اور نہ ان کو سولی دی مگر اُنہیں شبہ میں ڈال دیا گیا اور جو لوگ ان کے بارے میں

اختلاف کرتے ہیں وہ غلط خیال میں ہیں، ان کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں بجز تخمینی باتوں پر عمل کرنے کے، اور یقینی بات ہے کہ انہوں نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ حق تعالیٰ نے اپنی طرف ان کا مقام بلند فرما دیا اور حق تعالیٰ زبردست حکمت والے ہیں۔

زیر نظر آیت میں چند باتیں بطور خاص بیان کی گئی ہیں۔ اولاً اس بات کی تردید کی گئی ہے کہ یہودیوں کا یہ دعویٰ کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا یا انہیں سولی دے دی محض ظنی اور تخمینی دعویٰ ہے، جس کی کوئی اصلیت نہیں ہے البتہ انہیں اس بارے میں شبہ میں ڈال دیا گیا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے دھوکے میں ان کی شبیہ یا ان کے کسی ہم شکل کو سولی دے دی۔ پھر دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ جو لوگ ان کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں وہ غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں اور ان کے پاس اپنے کسی دعویٰ کی صداقت کے لیے کوئی واقعاتی شہادت یا عقلی دلیل نہیں ہے، یہ بات اس لیے کہی گئی کہ ایک طرف یہود یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا تو دوسری طرف نصاریٰ یہ کہہ رہے تھے کہ وہ سولی پانے کے بعد زندہ ہوکر آسمان پر اُٹھا لیے گئے۔ قرآن کریم یہود و نصاریٰ دونوں ہی کے غلط دعووں اور تخمینی اندازوں کی تردید کر رہا ہے کہ نہ وہ قتل کیے گئے اور نہ سولی پر چڑھائے گئے اور نہ ہی سولی پانے کے بعد زندہ ہوکر آسمان پر گئے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو یقیناً قتل نہیں کیا۔ ''بلکہ حق تعالیٰ نے اپنی طرف ان کے درجات بلند فرما دیے۔''

آیت کا یہی جملہ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ اس دعوے کی بنیاد بن گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ اُٹھا لیے گئے۔ مگر ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ یا رَافِعُکَ اِلَیَّ'' سے مراد یہ نہیں ہے کہ حق تعالیٰ نے انہیں اپنی طرف عرشِ الٰہی پر اُٹھا لیا یا پھر وہ یہ فرما رہے ہیں کہ میں تجھے اپنی طرف عرش پر اُٹھا لوں گا، بلکہ یہاں بھی لفظ ''اِلٰی'' اور ''رفع'' کا وہی مفہوم ہے جو قرآن کریم میں دوسرے مقامات پر مُراد لیا گیا ہے مثلاً اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ (ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں)۔ ظاہر ہے ہم سب مرنے کے بعد عرشِ الٰہی پر نہیں جائیں گے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بابل سے فلسطین کی طرف ہجرت کی تو اِنّــــی

مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ''میں اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں'' فرمایا۔ دوسرے مقام پر اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَيَهْدِيْنِ (37/99) ''میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں وہ مجھے رستہ دکھائے گا'' کہا تو یقیناً حضرت ابراہیم علیہ السلام آسمان یا عرشِ الٰہی پر تشریف نہیں لے گئے تھے۔

ایک متفق علیہ حدیث کے الفاظ ہیں۔ ''من هاجر الى الله و رسوله فهجرتهٔ الى الله و رسوله ...... الخ کہ جس نے اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے۔'' ان تمام مقامات پر لفظ ''اِلٰی'' کسی ظاہری سمت و جہت کے لیے استعمال نہیں کیا گیا بلکہ تقرب الى الله و الى الرسول اور اپنے اعمال و مساعی کے رخ کو حق تعالیٰ کی طرف موڑ دینے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

لفظ رفع کا مفہوم

لفظ ''اِلٰی'' کے قرآنی مفہوم کو سمجھ لینے کے بعد اب لفظ ''رفع'' کے معنی کو سمجھنے کی کوشش کیجیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا: وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ: ہم نے تیرے ذکر کو بلند فرمایا'' یا '' نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ (76:12) ہم جس کے چاہیں درجات بلند کر دیں'' یا ''وَّرَفَعْنٰهُ مَکَانًا عَلِيًّا (57:19) ہم نے اسے بلند مقام عطا کیا۔''

غرض کسی جگہ بھی لفظ ''رفع'' اور لفظ ''اِلٰی'' کے وہ معنی مراد نہیں ہیں جو اس مقام پر لیے جا رہے ہیں۔ کیونکہ حق تعالیٰ کی ذات مکان و جہت کی ہر قید سے آزاد ہے تو جسمانی طور پر اس کی طرف اُٹھائے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لہٰذا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ اور رَافِعُکَ اِلَیَّ کے معنی یہ ہوں گے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے یہاں ان کا مقام و مرتبہ بلند فرما دیا اور میں تمہیں اپنی طرف بلند مقام عطا فرمانے والا ہوں۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے رفع درجات کا یہ بیان بطورِ خاص اس لیے کیا گیا کہ یہود یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھا کر اپنے مزعومہ عقیدہ کے مطابق (نعوذ باللہ) ایک لعنتی شخص کی موت مارا تو ان کے اس بے ہودہ دعوے کے جواب میں حق تعالیٰ نے وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ ...... بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ فرما کر حضرت عیسیٰؑ کی بلندیٔ درجات کا اعلان اور یہودیوں کے غلط دعاوی کی تردید فرما دی۔

سورۂ آلِ عمران کی آیت

اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر زندہ اُٹھائے جانے کا کوئی جواز یا قرینہ موجود ہے یا نہیں۔ سورۂ آلِ عمران کی زیرِ نظر آیت بھی قابلِ توجہ ہے ''وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ O اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ..... اور ان لوگوں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ نے بھی تدبیر فرمائی اور حق تعالیٰ سب تدبیریں کرنے والوں سے بہتر تدبیر کرنے والے ہیں، اور جبکہ حق تعالیٰ نے فرمایا: اے عیسیٰ! میں بے شک تمہیں وفات دینے والا ہوں، اور تمہیں ان سے پاک رکھنے والا ہوں جو منکر ہیں اور تمہارے متبعین کو روزِ قیامت تک (ان) منکرینِ حق پر غالب کرنے والا ہوں، اور میں تمہیں اپنی طرف بلند مقام دینے والا ہوں۔

حق تعالیٰ کے چار وعدے

پہلا وعدہ

اس آیت کریمہ میں حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چار وعدے فرمائے ہیں، جن میں سب سے پہلا وعدہ یہ ہے کہ ''میں بے شک تمہیں وفات دینے والا ہوں۔'' بظاہر نظر یہ وعدہ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ موت، تو ہر فرد بشر بلکہ ہر ذی روح کو اپنے وقتِ موعود پر آنی ہے۔ ''کُل نفسٍ ذائقة الموت'' پھر عیسیٰ علیہ السلام سے بطور خاص یہ وعدہ فرمانے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن آپ اس وعدۂ خداوندی کو اس پس منظر میں دیکھیے کہ جب یہ وعدہ کیا گیا اس وقت بنی اسرائیل کے چند گنے چنے افراد (حوارین) کے علاوہ یہودی قوم کی غالب اکثریت آپ کو قتل کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔ ان حالات میں یہ وعدہ کہ تمہیں قتل کرنے یا سولی دینے کے لیے ان کی یہ کوشش ہرگز کامیاب نہ ہوسکیں گی کیونکہ ان کے مقابلے میں تمہیں حق تعالیٰ کی پوری پوری تائید و نصرت حاصل ہوگی جو تمام تدبیریں کرنے والوں سے بہتر تدبیر کرنے والے ہیں، زبردست اہمیت کا حامل بن جاتا ہے کہ اس کے نتیجے میں بنی اسرائیل کے لوگ جو حضرت عیسیٰ علیہ

السلام کے قتل و صلب کے درپے تھے اور وقت سے پہلے ان کی زندگی کا خاتمہ کر دینا چاہتے تھے، ہزار کوششوں کے باوجود اپنے اس ناپاک مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے اور حق تعالیٰ نے اُن کی زندگی کے دن پورے فرما دیے یعنی انہیں وقتِ موعود پر موت دی۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے بھی حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت میں ''انی متوفیک'' کی تفسیر ''ای ممیتک'' نقل کی ہے۔

دوسرا وعدہ

دوسرا وعدہ یہ ہے کہ ''میں تمہیں اپنی طرف بلند مقام دینے والا ہوں۔'' اگر یہاں ''وَرَافِعُكَ اِلَىَّ'' سے بحالتِ جسمانی زندہ اُٹھانا مُراد ہوتا تو یہ جملہ ''اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ'' سے پہلے آنا چاہیے تھا۔ کیونکہ از روئے روایات ''رفع الی السماء'' بحالت جسمانی پہلے ہوا اور موتِ آسمان سے نزول کے بعد قربِ قیامت کے وقت واقع ہوگی! مگر اس وقت ''اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ'' کے وعدے کی کوئی اہمیت باقی نہ رہے گی، کیونکہ زمین پر آنے کے بعد آپ کی وفات دوسرے عام انسانوں کی طرح طبعی موت کی صورت میں ہوگی۔ اس وعدے کی ضرورت و اہمیت اسی صورت میں باقی رہتی ہے جب بنی اسرائیل کی خفیہ تدابیر اور معاندانہ ریشہ دوانیوں کے علی الرغم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی دست رس سے بچا کر، پھر انہیں اور ان کے متبعین کو گروہ منکرین پر غالب فرما کر ان کی طبعی موت واقع ہو کہ ایک طرف منکرینِ حق کا گروہ انہیں قتل کرنے پر تُلا ہوا ہے تو دوسری طرف حق تعالیٰ اس وقت تو انہیں اشتباہ میں ڈال دیتے ہیں اور پھر جلد ہی فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظَاهِرِيْنَ O (الصّف) ''پس بنی اسرائیل کے کچھ لوگ تو ایمان لے آئے اور کچھ لوگ منکر رہے، پھر ہم نے اہلِ ایمان کی ان کے دشمنوں کے مقابلے میں تائید فرمائی تو وہ غالب آ گئے۔'' اپنی تائید و نصرت کے ذریعہ گروہ مومنین کو منکرینِ حق پر غالب فرما دیتے ہیں اور اسی غلبہ و کامرانی کی حالت میں وقتِ موعود پر ان کی طبعی موت واقع ہوتی ہے۔ اس تناظر میں ''وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ؑ'' کے جملے پر غور فرمائیے اور پھر ''اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ'' کے وعدے کی ضرورت و اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کیجیے تو بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ قوم یہود نے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی تدبیر کی، اس کے لیے ایک خفیہ منصوبہ بنایا اور اپنی دانست میں اس منصوبے کو عملی جامہ بھی پہنا دیا مگر حق تعالیٰ کی تدبیر ان کی ساری تدبیروں پر غالب آ کر رہی کہ ان کی شبیہ یا ان کا کوئی ہم شکل سولی پا گیا اور حق تعالیٰ نے اپنے نبی کو نہ صرف ان کے ہر شر سے محفوظ رکھا بلکہ جلد ہی سورۃ الصف کی مذکورہ آیت کے مطابق انہیں اور ان کے متبعین کو گروہ منکرین پر غالب فرما دیا، اس آیت میں یہ بات متبادر ہو رہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے متبعین کو یہود پر یہ غلبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی ہی میں حاصل ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں یہ کہنا کہ ''یہ غلبہ آسمانوں سے زمین پر تشریف لانے کے بعد قربِ قیامت کے وقت حاصل ہوگا'' محض ایک مفروضہ ہے جس کی تائید قرآن نہیں کرتا۔

تیسرا وعدہ

آیت زیر نظر کا تیسرا وعدہ ''کہ میں تمہیں ان لوگوں سے پاک رکھنے والا ہوں جو منکر ہیں'' بھی یہی تاثر دے رہا ہے کہ مسیح علیہ السلام کو اس امر کی یقین دہانی کرائی جا رہی ہے کہ تمہارے دشمنوں کے ناپاک ہاتھ تم تک نہ پہنچ سکیں گے اور تمہیں ان کے ہر شر اور ہر مخالفانہ تدبیر سے محفوظ و مامون رکھا جائے گا۔

چوتھا وعدہ

اس آیت کا چوتھا وعدہ کہ ''میں تمہارے متبعین کو بنی اسرائیل کے منکرین حق پر روزِ قیامت تلک غالب کرنے والا ہوں'' تو اس کی صداقت سورۃ الصّف کی مذکورہ آیات کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی ہی میں ظاہر ہو چکی تھی اور اس وعدے پر دو ہزار کی طویل مدت گزر جانے کے باوجود آج بھی یہودی قوم عیسائی اقوام ہی کے سایۂ عاطفت میں سانس لے رہی ہے، چنانچہ موجودہ نام نہاد اسرائیلی حکومت ان ہی کی کوششوں سے قائم ہوئی اور ان ہی کے تعاون و تائید کی بدولت اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے، اگر امریکہ، برطانیہ اور دوسری عیسائی اقوام اپنا دستِ تعاون اُٹھالیں تو صیہونی حکومت کو اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے دنیا میں کہیں جائے پناہ نصیب نہ ہو۔

ان چاروں وعدوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے متبعین کے حق میں یہودی قوم پر ان کے غلبے اور برتری کا جو پہلو پایا جاتا ہے وہ اسی صورت میں قائم رہتا ہے جب یہود کی تدابیرِ قتل و صلب کو ناکام بنا کر آپ کی طبعی موت اسی وقت واقع ہو، بصورتِ دیگر آسمان سے نزول کے بعد عام حالات میں موت واقع ہوتی ہے تو جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ'' کے وعدے کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی بلکہ اس کے مقابلے میں ''اِنِّیْ رَافِعُکَ اِلَیَّ'' کے وعدے میں جسمانی طور پر رفع الی السماء کی مزعومہ شکل کے ساتھ بظاہر ترفّع کا ایک پہلو موجود ہے مگر یہ جملہ چونکہ ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ'' کے بعد آیا ہے لہٰذا وفات کے بعد ترفّع کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو ''رَافِعُکَ اِلَیَّ'' سے بلندئ درجات مُراد لی جائے یا پھر اسے بھی مجازی معنوں پر محمول کیا جائے کہ ''میں تمہیں تمہاری طبعی موت کی صورت میں اپنی طرف اُٹھانے والا ہوں'' کہ یہ دونوں معنی وفات کے بعد درست قرار دیے جا سکتے ہیں اور آخر الذکر معنی بھی اگرچہ مجازی معنی ہی ہیں مگر محاورتاً دنیا کی ہر زبان میں اسی طرح استعمال ہوتے ہیں، جیسا کہ ہم اپنی روزمرّہ کی بول چال میں ہر مرنے والے شخص کے لیے کہہ دیتے ہیں کہ وہ اللہ کو پیارا ہو گیا...... واصل بحق ہو گیا...... اللہ نے اسے اُٹھا لیا، مگر ان جملوں کے استعمال کرنے پر کوئی یہ نہیں کہتا کہ ان سے زندہ اُٹھا لینا بھی مُراد ہو سکتا ہے!

رافعک الیّ پر مولانا اصلاحی کا نقطۂ نظر

مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر قرآن ''تدبر قرآن'' میں ''رَافِعُکَ اِلَیَّ'' پر اچھی خاصی بحث کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ''رَافِعُکَ اِلَیَّ'' کے معنی مجرد رفع درجات لینا صحیح نہیں ہے۔ اس صورت میں ''اِلَیَّ'' کا لفظ بالکل بے ضرورت ہو کر رہ جاتا ہے اور قرآن میں کوئی لفظ بے ضرورت استعمال نہیں ہوا۔ اگر صرف درجے کی بلندی کا اظہار مقصود ہوتا تو عربیت کے لحاظ سے ''رَافِعُکَ'' کافی تھا، ''اِلَیَّ'' کی ضرورت نہیں تھی۔ قرآن میں دیکھ لیجیے، جہاں بھی یہ لفظ بلندئ مرتبہ کے لیے استعمال ہوا ہے، بغیر ''اِلَیّ'' کے استعمال ہوا ہے۔

جواباً عرض ہے کہ مولانا اصلاحی نے اپنے استدلال میں جو آیات نقل کی ہیں مثلاً وَرَفَعَ بَعْضَھُمْ دَرَجٰتٍ ؕ (البقرہ2:253) ''اور ان بعض کے درجات بلند کیے۔'' وَرَفَعْنٰهُ

مَکَانًا عَلِیًّاo (مریم 57:19)''اور ہم نے اس کو مقام بلند پر فائز کیا۔'' وغیرہ تو ان مقامات پر مجرد بلندیٔ درجات کا بیان ہے کہ حق تعالیٰ نے بعض حضرات انبیا کے درجات بلند فرما دیے یا کسی کو مقام بلند پر فائز کر دیا۔ لیکن زیر نظر آیات ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ'' یا ''رَافِعُکَ اِلَیَّ'' میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفعِ درجات کے سلسلے میں جو ''اِلَیْهِ'' اور ''اِلَیَّ'' کی اضافت حق تعالیٰ کی طرف ظاہر کی گئی ہے تو اس کے اسباب وقرائن کا تقاضا یہی تھا کہ ان کی بلندیٔ درجات کو مجرد شکل میں بیان نہ کیا جائے بلکہ اس کی نسبت حق تعالیٰ کی ذات کی طرف راجع کی جائے کہ ان کا یہ مقام بلند بارگاہِ خداوندی سے قبول پا چکا ہے اور یہ بلندیٔ درجات انہیں حق تعالیٰ کی طرف سے بطور خاص حاصل ہوئی ہے، یا حاصل ہوگی۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے شر پسند افراد ایک طرف خود ان پر اور ان کی والدۂ محترمہ حضرت مریم علیہا السلام کی ذات پر طرح طرح کے جھوٹے الزامات لگا کر انہیں مطعون کر رہے تھے تو دوسری طرف ان پر اسلاف کی روایات توڑنے اور بزرگوں کی توہین کے الزام لگا رہے تھے، پھر اپنے خاص آدمی بھیج بھیج کر ان سے ایسے سوالات کر رہے تھے جن کے جوابات سے ان کے خلاف کفر و ارتداد کے فتاویٰ حاصل کر کے انہیں واجب القتل قرار دیا جا سکے۔ تو ان حالات میں عیسیٰ علیہ السلام کی بلندیٔ درجات کا مجرد ذکر کافی نہ تھا بلکہ اس ترفّع کی نسبت کو حق تعالیٰ کی طرف راجع کرتے ہوئے بیان کرنے کی ضرورت تھی، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور ''اِلَیَّ'' اور ''اِلَیْهِ'' کی الحاقی ضمیروں کے ذریعہ بتا دیا کہ ''حق تعالیٰ نے اپنی بارگاہ میں انہیں خاص عزت و احترام کا مقام بلند عطا فرمایا ہے۔'' اور صرف یہی نہیں بلکہ جن مقامات پر بھی حق تعالیٰ کے خصوصی انعام و اکرام کا ذکر کیا گیا ہے وہاں حق تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت ظاہر کر دی گئی ہے۔ مثلاً ''فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ'' (پس حق تعالیٰ کے پاس ان کا اجر و ثواب ہے)، ''لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ'' (ان لوگوں کے لیے ان کے رب کے پاس سلامتی کا گھر ہے)، ''لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ'' (ان کے رب کے پاس ان کے بڑے درجات ہیں)۔ اور یہ سارے بیانات مومنین قانتین کے درجات کے بارے میں بیان کیے جا رہے ہیں تو جس طرح مولانا اصلاحی ''رَافِعُکَ اِلَیَّ'' کے ضمن میں فرما رہے ہیں کہ ''اگر صرف درجے کی بلندی کا اظہار مقصود ہوتا تو عربیت کے لحاظ سے ''رَافِعُکَ'' کافی تھا۔ اسی طرح ہم ان مثالوں کے

بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ''فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ'' کافی تھا، ''عِنْدَ رَبِّهِمْ'' کے اضافے کی ضرورت نہ تھی۔ یا صرف ''لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ'' کہہ دینا کافی تھا، یہاں بھی ''عِنْدَ رَبِّهِمْ'' کے اضافے کی ضرورت نہ تھی۔ اسی طرح ''لَهُمْ دَرَجٰتٌ'' کہہ دینا کافی تھا، ''عِنْدَ رَبِّهِمْ'' کی الحاقی اضافت کی ضرورت نہ تھی اور ''وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ'' میں بھی ''وَرَفَعْنَا ذِکْرَکَ'' کہہ دینا کافی تھا ''لَکَ'' کے اضافے کی چنداں ضرورت نہ تھی، لیکن یہاں حق تعالیٰ چونکہ بطور خاص یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آپؐ کے رفعِ ذکر سے محض آپؐ کے ذکر اور نام کی بلندی ہی مقصود نہیں ہے بلکہ ہمیں آپ کی پاسِ خاطر بھی ملحوظ ہے۔ اس لیے یہاں ''رَفَعْنَا'' اور ''ذِکْرَکَ'' کے درمیان ''لَکَ'' کا اضافہ ضروری تھا جس سے آپؐ کے پاسِ خاطر کا اظہار بھی ہو گیا۔

ان مثالوں کے ذریعہ ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عام حالات میں تو رفع درجات کا مجرد ذکر کافی ہوتا ہے لیکن جہاں کسی خصوصیت کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے تو وہاں رفع درجات کے ذکر کے ساتھ ''عِنْدَ رَبِّهِمْ''، ''عِنْدَ اللّٰهِ''، ''اِلَی اللّٰهِ''، ''اِلَیْهِ'' یا ''اِلَیَّ'' کے اضافات قرآن کی بے شمار آیات میں موجود ہیں اور کسی جگہ بھی یہ از قبیل حشو و زوائد نہیں ہیں بلکہ ہر جگہ ان اضافات کے لیے کوئی نہ کوئی موزوں قرینہ موجود ہے! کیونکہ خود بقول مولانا اصلاحی ''قرآن میں کوئی لفظ بھی بے ضرورت استعمال نہیں ہوا ہے۔''

رفع الی السماء، توفی ہی کی ایک شکل تھی

اور جب مولانا اصلاحی کے نزدیک بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ''توفی'' ہی اس شکل میں ہوئی ہے کہ انہیں بحالت جسمانی زندہ آسمان پر اُٹھا لیا گیا اور اب زمین پر دوبارہ ان کا نزول نہیں ہوگا تو اس تعبیر کے مطابق ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ'' کا اندازِ بیان ان کی بیان کردہ صورت حال کو ظاہر نہیں کرتا کیونکہ یہاں وقوعِ وفات کے بعد ''رَافِعُکَ اِلَیَّ'' کا ذکر ہو رہا ہے جبکہ مولانا اصلاحی کی مبینہ تعبیر کے مطابق ''اِنِّیْ رَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُتَوَفِّیْکَ'' کا جملہ ہونا چاہیے تھا تاکہ بات صاف ہو جاتی اور صورت کے سمجھنے میں کوئی ابہام باقی نہ رہتا۔

لیکن جہاں تک ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ'' کے جملے کا تعلق ہے وفات یا موت کے علاوہ اس

کے کوئی دوسرے معنی نہیں ہو سکتے، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اپنے ترجمۂ قرآن میں لغت اور
محاورے کے مطابق فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کا جو ترجمہ (بے شک جب تو نے میرے دن پورے
کر دیے) کیا وہ بھی اسی مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔ جن حضرات نے ''إِنِّي مُتَوَفِّيكَ'' اور
''رَافِعُكَ'' کو ہم معنی بنا دیا ہے اُن کے پاس اس کا کوئی قرینہ یا جواز موجود نہیں ہے کیونکہ قرآن
کریم میں یہ لفظ اپنی مختلف صورتوں میں اکثر و بیشتر موت ہی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے مثلاً
سورۂ آل عمران میں ہے: رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ع
(193) ''اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہ بخش دے اور ہماری برائیوں کو مٹا دے اور ہمارا
خاتمہ نیکوں کے ساتھ کر۔'' پھر سورۂ اعراف میں ہے: رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَفَّنَا
مُسْلِمِينَ ع (126) ''اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر (کی کیفیت) طاری کر اور ہمیں اسلام
ہی کی حالت میں موت دے۔'' پھر سورۂ نحل میں ہے: وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفَّاكُمْ...... الخ
''اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا پھر وہی تمہیں موت دیتا ہے۔'' غرض یہ لفظ قرآن کریم میں بکثرت
انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہ بات ان لوگوں کے جواب میں کہی گئی ہے جنہوں نے
''إِنِّي مُتَوَفِّيكَ'' کا ترجمہ ''بے شک میں تمہیں اُٹھانے والا ہوں۔'' کیا ہے مگر جو لوگ
ترجمہ تو درست کرتے ہیں لیکن اس سے مراد آسمان سے نزول کے بعد کی موت کے لیتے ہیں،
ان کے جواب میں ہم یہی عرض کریں گے کہ ایسی موت کے وعدے کی کوئی اہمیت نہیں ہے
کیونکہ یہ موت عام حالات میں ہوگی جب مقابلے پر قومِ یہود کی خفیہ تدابیر اور مخالفانہ ریشہ
دوانیاں موجود نہ ہوں گی بلکہ از روئے روایات تمام یہود و نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان
لا چکے ہوں گے تو ان حالات میں حق تعالیٰ کی طرف سے خصوصی طور پر یہ وعدہ فرمانے کی کیا
ضرورت تھی کہ ''میں تمہیں موت دینے والا ہوں۔'' اس پر اگر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے تو
''إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ'' کے وعدے میں (مفروضہ عقیدے کے مطابق) نصاریٰ
کے اس خیال کی تو کسی نہ کسی حد تک گنجائش نکل آتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پہلے مصلوب کیا
گیا پھر وہ زندہ ہو کر آسمان پر اُٹھا لیے گئے کہ اس طرح ''رفع الی السماء'' وفات کے بعد
واقع ہوا مگر ہمارے مزعومہ عقیدے کے لیے کوئی ادنیٰ سی گنجائش بھی نہیں نکلتی کیونکہ حق تعالیٰ فرما

رہے ہیں: ''اے عیسیٰ میں تمہیں وفات دینے والا ہوں اور تمہیں اپنی طرف مقام بلند دینے والا
ہوں اور تمہیں منکرین سے پاک رکھنے والا ہوں اور تمہارے متبعین کو روزِ قیامت تک منکرین پر
غالب کرنے والا ہوں۔'' لیکن وہ اپنا پہلا وعدہ تو پورا نہیں فرماتے، باقی تینوں وعدے حضرت عیسیٰ
علیہ السلام کی زندگی ہی میں پورے کر دیتے ہیں۔ اور یہ (موت دینے والا) پہلا وعدہ دو ہزار سال
کے طویل عرصے سے یونہی معلق چلا آ رہا ہے اور نہ جانے مزید کتنے ہزار ہا ہزار سال تک اسی طرح
معلق رہے گا اور جب قربِ قیامت کے وقت پورا ہوگا تو اس کی کوئی ضرورت و اہمیت باقی نہ رہے
گی تو صورت حالات کا یہ نقشہ کم از کم ہماری فہم ناقص سے تو بہت بلند و بالا ہے۔

ہماری فہم و فراست کے مطابق حق تعالیٰ کے یہ چاروں وعدے اپنی منطقی ترتیب کے
ساتھ پورے ہو چکے ہیں اور اس نے اپنے کسی وعدے کو وعدۂ فردا بنا کر معلق نہیں چھوڑا۔ یہودیوں
کی مخالفانہ تدبیروں اور معاندانہ ریشہ دوانیوں کے علی الرغم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو طبعی موت دی،
آپ کے مقام کو بلند فرمایا، آپ کو منکرینِ حق سے پاک رکھا اور آپ کے متبعین کو آپ کی زندگی ہی
میں ان پر غالب فرما دیا اور یہ غلبہ قیامت تک برقرار رہے گا بشرطیکہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ
السلام کے ساتھ کوئی معمولی سی برائے نام نسبت قائم رکھی، کیونکہ حق تعالیٰ کا یہ وعدہ ''وَجَاعِلُ
الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع
کے ساتھ مشروط ہے۔ بصورت دیگر ''اذا فات الشرط فات المشروط'' کے قاعدۂ کلیہ پر
عمل ہوگا۔

سورۂ مائدہ کی آیات

اس کے بعد سورۂ مائدہ کی آیات نمبر 116، 117 پر غور فرمائیے:

وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ
اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ ط قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ
لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ ء إِن كُنتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ ط
تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ ط إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ
الْغُيُوبِ ○ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي

وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ○

''اور جبکہا اللہ تعالیٰ نے اے عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کیا تم نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو بھی خدا کے علاوہ معبود قرار دے لو، تو عیسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کیا میں تو آپ کو (ہر شرک سے) منزہ سمجھتا ہوں، مجھے کس طرح زیبا تھا کہ میں ایسی بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں، اگر میں نے کہا ہوگا تو آپ کو اس کا (ضرور) علم ہوگا (کیونکہ) آپ تو میرے دل کے اندر کی بات بھی جانتے ہیں اور میں جو کچھ آپ کے علم میں ہے اسے نہیں جانتا، بے شک آپ ہی تمام غیبوں کے جاننے والے ہیں۔ میں نے ان سے بجز اس کے اور کچھ نہیں کہا جو آپ ہی نے مجھے (ان سے) کہنے کو فرمایا تھا کہ تم (سب) اللہ کی بندگی اختیار کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی، اور میں تو ان (کے حالات) پر اسی وقت تک باخبر رہا جب تک ان میں رہا۔ پھر جب آپ نے مجھے وفات دے دی تو پھر ان پر آپ ہی نگران حال تھے اور آپ تو ہر بات کی پوری پوری خبر رکھتے ہیں۔''

آیت کریمہ کا یہ جملہ ''وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ'' خاص طور پر قابل توجہ ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمارہے ہیں کہ میں تو اپنی قوم کے حالات پر اسی وقت تک باخبر رہا جب تک ان کے درمیان موجود تھا، پھر جب آپ نے مجھے موت دے دی تو پھر آپ ہی ان کے نگران حال تھے (مجھے کیا معلوم کہ انہوں نے میرے بعد کیا روش اختیار کی؟)۔

''مادمت فیھم'' اور ''فلما توفیتنی'' کی بحث

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حق تعالیٰ کے درمیان یہ مکالمہ ان کی وفات کے بعد ہوا یا قیامت کے دن ہوگا، اس سے قطع نظر ہم یہاں صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حق تعالیٰ سے جواباً یہ عرض کر رہے ہیں کہ میں ان کے درمیان اپنی موجودگی کے زمانے تک ہی ان

کے حالات سے باخبر رہ سکتا ہوں، اس کے بعد انہوں نے جو کچھ کیا اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی باخبری کا یہ زمانہ جس کا وہ ذکر فرمارہے ہیں بہرحال آپ کی وفات یا بصورت دیگر ''رفع الی السماء'' سے قبل ہی کا زمانہ ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر ہم ''رفع الی السماء'' کے تصور کو قبول کرلیتے ہیں تو اس سے لازم آتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام چونکہ آسمان پر زندہ اُٹھالیے گئے ہیں اور ان کی وفات ہنوز واقع نہیں ہوئی بلکہ قرب قیامت کے وقت آسمان سے نزول کے بعد ہوگی، تو اس صورت میں ان کے جواب کا یہ جز تو درست ہوگا کہ ''میں اس وقت تک باخبر رہا جب تک ان میں رہا'' مگر جواب کا اگلا جز کہ ''جب تو نے مجھے موت دے دی ......الخ'' درست قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ آپ نے اپنے جواب کے اس حصے میں حق تعالیٰ کے نگران ہونے کا زمانہ اپنی وفات کے بعد کا زمانہ قرار دیا ہے، ''ما دمت فیھم'' کے بعد کا زمانہ قرار نہیں دیا اور موت کے بعد کا زمانہ ابھی تک پیش ہی نہیں آیا، تو ان کے جواب کا یہ جزو کیسے صحیح قرار دیا جاسکتا ہے؟ یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی باخبری کا زمانہ تو ''ما دمت فیھم'' تک تھا اور حق تعالیٰ کی نگرانی کا زمانہ ''فلما توفیتنی'' کے بعد شروع ہوگا تو گزشتہ دو ہزار سال کی یہ طویل مدت جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اُٹھائے جانے سے اب تک گزر چکی ہے اور ابھی نہ جانے کتنے ہزار سال ان کے آسمان سے نزول اور وفات پانے تک اور گزریں گے تو اس ہزاروں سال پر محیط درمیانی مدت میں قوم نصاریٰ پر نگرانِ حال کون ہوگا؟ جبکہ اس قوم کی تمام مشرکانہ گمراہیاں (عقیدۂ تثلیث وغیرہ) اسی زمانے سے تعلق رکھتی ہیں جس کا کوئی شہید ور قیب نہیں ہے۔

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جواب کا انداز بیان

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مذکورہ جواب کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ یہ جواب بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ قیامت کے دن دوسرے تمام پیغمبر حق تعالیٰ کے سامنے اپنے علم ومشاہدات کی نفی کرتے ہوئے ادباً وتعظیماً عرض کریں گے: يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (مائدہ: 109) ''جس دن

حق تعالیٰ تمام رسولوں کو جمع فرمائیں گے اور ان سے کہیں گے کہ تمہیں کیا جواب ملا تو وہ جواب دیں گے کہ ہمیں تو کچھ معلوم نہیں بے شک آپ ہی تمام غیبوں کو بخوبی جاننے والے ہیں!'' چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام نے بھی مذکورہ جواب میں اپنے علم ومشاہدات کی نفی کی ہے لہٰذا ''مَا دُمْتُ فِيهِمْ'' یا ''فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ'' سے کوئی استدلال نہیں کیا جا سکتا!

جواباً عرض ہے کہ حق تعالیٰ کے علم لامتناہی کے مقابلے میں حضرت عیسیٰؑ کے جواب میں اپنے علم ومشاہدہ کی نفی کا یہ پہلو تو پہلے ہی موجود ہے جب وہ فرماتے ہیں ''اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ط تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ط اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ. اگر میں نے کہا ہوگا تو آپ کو اس کا ضرور علم ہوگا، آپ تو میرے دل کے اندر کی بات بھی جانتے ہیں اور میں جو کچھ آپ کے علم میں ہے اسے نہیں جانتا۔ بے شک آپ تمام غیبوں کے بخوبی جاننے والے ہیں۔'' مگر اس اعتراف کے بعد اس سے اگلی آیت میں وہ ایک اَمر واقعی کے اظہار کے طور پر یہ فرما رہے ہیں کہ اس حقیقت کے باوجود کہ ان میں میری موجودگی کے زمانے میں بھی ان کی باطنی کیفیات اور دِلوں کے حال سے تو ہی باخبر تھا کہ وہ تجھے دل سے مانتے بھی تھے یا نہیں؟ کیونکہ تو ہی تمام غیبوں کا جاننے والا ہے، البتہ ان کے ظاہری حالات واطوار پر میں اس وقت تک ضرور باخبر رہا جب تک ان کے درمیان موجود رہا مگر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو ان کے ظاہر وباطن کا نگران تو ہی تھا۔

دیکھیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اختیار کردہ اسلوب بیان میں دیگر انبیا علیہم السلام کے مقابلے میں اپنی لاعلمی اور اعتراف عجز کا پہلو زیادہ واضح شکل میں موجود ہے کیونکہ وہ لَا عِلْمَ لَنَا اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْب کہہ کر بات ختم نہیں کر دیتے بلکہ وہ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ط تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ کے اضافے کے ساتھ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ فرما رہے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس اَمر واقعی کا اظہار بھی فرما رہے ہیں کہ اگرچہ ان کے درمیان رہتے ہوئے بھی میری معلومات اس درجہ ناقص ونامکمل تھیں کہ ان کی قلبی کیفیات کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتا سکتا، البتہ ان کے ظاہری حالات سے اس وقت تک ضرور باخبر رہا ہوں جب تک ان میں موجود رہا۔

اور اپنی کوتاہی علم کے اعتراف کے ساتھ حق تعالیٰ کے سامنے کسی اَمر واقعی کا اظہار سوئے ادب میں شمار نہیں کیا جاتا، جیسا کہ سورۂ یونس کی آیات نمبر (28.29) سے ظاہر ہو رہا ہے:

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَ شُرَكَآءُكُمْ. فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَآءُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ (28) فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ (29)

''اور جس دن ہم سب کو جمع کریں گے، پھر ان سے کہیں گے جنہوں نے شریک ٹھہرایا کہ تم اور تمہارے شرکا اپنی جگہ ٹھہرو، پھر ہم ان کے درمیان پھوٹ ڈال دیں گے اور ان کے شرکا کہیں گے کہ تم (تو) ہماری عبادت نہیں کرتے تھے، سو اللہ ہمارے تمہارے درمیان بطور گواہ کافی ہے کہ ہم تمہاری عبادت سے بالکل بے خبر تھے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو اپنے اعتراف لاعلمی کے ساتھ محض ایک اَمر واقعی کا اظہار فرمایا تھا، جبکہ آیت مذکورۃ الصدر میں یہ شرکا (جن میں دیگر معبودان باطل کے علاوہ بہت سے انبیا واولیا اور ملائکہ بھی شامل ہوں گے (کیونکہ مشرکین نے انہیں بھی معبود بنایا ہوا ہے)، حق تعالیٰ کے رُوبرو اپنے ان پرستش کرنے والوں کو صاف صاف جھٹلا دیں گے اور کہیں گے کہ اوّل تو تم نے ہماری عبادت کی ہی نہیں اور اگر کی ہے تو ہم اس سے بالکل بے خبر اور لاتعلق ہیں اور ہمارے تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے کہ ہم میں سے کون سچا اور کون جھوٹا ہے؟

کسی اَمر واقعی کا اظہار سوئے ادب نہیں

مذکورہ آیت کے بیان سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ حق تعالیٰ کے سامنے کسی اَمر واقعی کا اظہار سوئے ادب نہیں ہے ورنہ یہ شرکا (بشمول انبیا واولیا اور ملائکہ) بھی حق تعالیٰ کے دریافت فرمانے پر مشرکین کو جھٹلانے کی بجائے جواباً یہی عرض کر دیتے! ''لَا عِلْمَ لَنَا ط اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ. کہ ہمیں تو کچھ معلوم نہیں بے شک تو ہی غیبوں کا جاننے والا ہے۔'' سورۂ

فرقان کی آیات 17 تا 19 میں بھی حق تعالیٰ کی سخت وعید کے ساتھ جو مشرکین کے بارے میں آئی ہے، شرکا کی طرف سے مشرکین کو جھٹلانے کا ذکر بصراحت موجود ہے۔

سورۂ مریم کی آیات

اس کے بعد سورۂ مریم کی ان آیات پر نظر ڈالیے:

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ط اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِيًّا (30)
وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ ص وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا
دُمْتُ حَیًّا (31) وَّ بَرًّا بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا (32)
وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَ یَوْمَ اَمُوْتُ وَ یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا (33)
ذٰلِكَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ ج قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِیْ فِیْهِ یَمْتَرُوْنَ (34)

"وہ بچہ بول اُٹھا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی اور اس نے مجھے نبی بنایا اور مجھے بابرکت بنایا میں جہاں کہیں بھی ہوں، اور اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں اور مجھے میری والدہ کا خدمت گار بنایا اور اس نے مجھے سرکش بدبخت نہیں بنایا اور مجھ پر سلام ہو جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن میں زندہ کر کے اُٹھایا جاؤں گا، یہ ہیں عیسیٰ ابن مریم، حق بات یہی ہے جس میں یہ لوگ جھگڑ رہے ہیں۔"

ان آیات میں چند باتیں نہایت قابلِ توجہ ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام پر لعن وطعن کرنے والوں سے گہوارہ میں کلام کرتے ہوئے فرمائی تھیں، کہ میں اللہ کا ایک خاص بندہ ہوں جس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا، اور مجھے بابرکت بنایا، میں جہاں کہیں بھی ہوں اور جب تک میں زندہ رہوں، مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا۔ یہاں صاحب کتاب نبی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے بابرکت ہونے کا ذکر "اَیْنَ مَا كُنْتُ" کے الفاظ کے ساتھ فرمارہے ہیں کہ میں جہاں کہیں بھی رہوں، میرے صاحبِ کتاب نبی اور بابرکت ہونے کی مذکورہ حیثیتیں برقرار رہیں گی۔

قربِ قیامت تک حضرت عیسیٰ کی نبوت کا اثبات

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو اپنی ان خصوصیات کا اثبات اپنی زندگی تک کے لیے کیا تھا جو بالکل درست تھا مگر خود ہمارے عقیدۂ حیاتِ مسیحؑ نے ان کی نبوت ورسالت کا اثبات قربِ قیامت تک کے لیے کر دیا اور اس طرح ہم نے خود اپنے ہاتھ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا کیونکہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام بحالت جسمانی آسمان پر زندہ موجود ہیں تو وہ اس وقت بھی نبی ہیں اور جب دوبارہ زمین پر تشریف لائیں گے تب بھی نبی ہوں گے کیونکہ ان کی زندگی کا تسلسل قائم ہے اور اس وقت تک قائم رہے گا جب تک زمین پر آنے کے بعد ان کی موت واقع نہیں ہو جاتی، اور پھر ہمارا یہ عقیدہ بھی تو ہے کہ "لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ" کا وعدۂ خداوندی بھی (جو درحقیقت حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا تھا کہ آپ کو مبعوث فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ آپ کے ذریعہ اسلام کو تمام ادیانِ عالم پر غالب فرمانا چاہتا ہے) قطعی طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کے ہاتھوں پورا ہوگا (دیکھیے ترجمۂ قرآن مولانا محمود الحسنؒ، حاشیہ از شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ)۔ اندریں حالات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ کیونکہ زیرِ نظر آیات کے یہ دو جملے "ایـن مـا کنت" میں جہاں کہیں بھی ہوں اور "ما دمت حیا" جب تک میں زندہ رہوں، انہی مطالب و معانی پر دلالت کرتے ہیں جن کی وضاحت ہم نے سطورِ بالا میں کی ہے۔ صاحب کتاب نبی ہونا، اور بابرکت ہونا، یہ دونوں باتیں "ایـن مـا کنت" کے ساتھ وابستہ ہیں کہ میں جہاں کہیں بھی ہوں، میری دونوں حیثیتیں بہرحال برقرار رہیں گی، تو اس کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اُٹھائے جانے سے پہلے بھی نبی تھے، وہ اس وقت بھی نبی ہیں اور جب دوبارہ زمین پر تشریف لائیں گے تب بھی نبی ہوں گے، کیونکہ "ایـن مـا کـنـت" کا تقاضا یہی ہے کہ نقل مکانی سے ان کی یہ دونوں حیثیتیں متاثر نہ ہوں پھر فرماتے ہیں "وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا" اور اس نے مجھے (نظام) صلوٰۃ اور (نظام) زکوٰۃ (قائم کرنے) کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں۔ یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ ایک عام انسان کے لیے تو ان ہر دو فرائض کی بجا آوری کا حکم اس کی ذات تک محدود ہوتا ہے کہ اس نے جونہی یہ فرائض

ادا کردیے وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوگیا مگر ایک صاحب کتاب نبی کے لیے یہی حکم نظام صلوٰۃ اور نظام زکوٰۃ کے قیام سے عبارت ہوتا ہے۔ اور یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ جس قوم کی طرف مبعوث کیا گیا ہے اس میں ان دونوں نظاموں کو پوری طرح جاری اور نافذ کرے کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنے منصب نبوت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا اور یہ ذمہ داریاں اس کی زندگی کے آخری سانس تک باقی رہتی ہیں۔ اسی لیے آیت زیرِ نظر میں بھی ان ذمہ داریوں کی بجاآوری کو "مَا دُمْتُ حَيًّا" کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے، لہٰذا ان دونوں صورتوں یعنی "این ما کنت" اور "ما دمت حیا" میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور فرائض نبوت کی بجاآوری ہر قیدِ مکانی اور قیدِ زمانی سے آزاد ہوجاتی ہے اور ان کی زندگی کو تو ہم نے پہلے ہی قربِ قیامت تک طول دے کر جاوداں بنادیا ہے:

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

سلب نبوت کا تصور یا عقیدۂ ختم نبوت کی نفی

اور اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب دوبارہ زمین پر تشریف لائیں گے تو از روئے روایات ان کی حیثیت نبی کی نہ ہوگی بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عام اُمتی کی حیثیت سے اشاعت اسلام اور غلبۂ اسلام کے لیے کام کریں گے تو اس صورت میں اوّل تو آپؑ کے ارشاد "وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا وَجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ" کہ حق تعالیٰ نے مجھے نبی بنایا اور بابرکت بنایا (دریں حالت کہ) "میں جہاں کہیں بھی ہوں" کی نفی ہوتی ہے اور اس پر دوسرا زبردست اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی کسی آیت سے اشارتاً بھی سلب نبوت کا کوئی تصور ثابت نہیں ہے، جس کی بنا پر ایک صاحب کتاب نبی کو مسلوب النبوت فرما کر ایک عام اُمتی کا درجہ دے دیا جائے، لہٰذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت کا اثبات قربِ قیامت تک ہوجاتا ہے، جس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے عقیدہ کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کیونکہ بیک وقت دو عالم گیر نبوتیں مجتمع نہیں ہوسکتیں اور عقیدۂ ختم نبوت کی موجودگی میں تو کسی ظلّی و بروزی نبوت کا تصور بھی قبول نہیں کیا جاسکتا۔ چہ جائیکہ ایک ایسے صاحب کتاب نبی کی رسالت کو تسلیم کرلیا جائے، جس کی نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے زمانۂ ماقبل سے

شروع ہوکر قربِ قیامت تک جاری و ساری رہے؟

اس صورت حال میں ہمیں لازماً "عقیدۂ ختم نبوت" اور "عقیدۂ حیاتِ مسیحؑ" میں سے کسی ایک عقیدے کا انتخاب کرنا ہوگا اور دوسرے عقیدے سے دست بردار ہونا پڑے گا کہ دونوں عقیدے ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے۔

یا چناں کن یا چنیں

مولانا سندھی کا نقطۂ نظر

مولانا سندھیؒ اپنی تفسیر قرآن "الہام الرحمٰن" میں سورۂ آل عمران کی مذکورہ آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اور "متوفیک" کا معنی "ممیتک" ہے (یعنی میں تجھے موت دوں گا) اور جو لوگوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے بارے میں مشہور ہے، پس یہ یہودیوں اور صابیہ کی عبارتیں ہیں جو مسلمانوں میں مشہور ہوئیں۔ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قتل کے بعد انصار بنی ہاشم جو کہ صابئہ میں سے تھے، کے ذریعہ سے ان یہودیوں نے مشہور کیا جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے موالی میں سے تھے۔ انہوں نے یہ مشہور محبت سے نہیں بلکہ اسلام اور مسلمانوں سے بغض کی وجہ سے کیا ہے جبکہ انہوں نے اس آیت پر غور نہیں کیا (ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ) اور اس کو (یعنی حیاتِ عیسیٰ) کو عقیدہ بنالیا، اس آیت کا معنی صرف اجتماعیت عامہ پر یقین رکھنے والے ہی سمجھتے ہیں، جو اس میں ماہر ہوتے ہیں۔ جو لوگ ان روایات پر ایمان لاتے ہیں اور ان کو ہمارے پاس لاتے ہیں، وہ علم اجتماعیہ میں بعید ترین لوگوں میں سے ہیں جبکہ وہ آیت کے معنی سے جاہل ہیں۔ پس یہ لوگ ان روایات کو قبول کرتے ہیں اور ان سے متاثر ہوتے ہیں اور یہ بات پوشیدہ نہیں کہ علوم اسلامیہ کے تمام شعبوں کا مرجع و منبع

قرآن عظیم ہے اور اس میں کوئی آیت ایسی نہیں جو صراحۃً اس بات پر دلالت کرے کہ عیسیٰ علیہ السلام فوت نہیں ہوئے اور یہ کہ وہ زندہ ہیں اور نازل ہوں گے، سوائے اخذ کردہ (استنباطات) دلائل کے اور بعض تفسیروں کے، اور یہ (یعنی اخذ کردہ دلائل اور تفسیرات) شک وشبہ سے خالی نہیں ہیں اور جو چیز اس درجہ کی ہو کیسے ممکن ہے کہ ہم اس کو عقیدۂ اسلامیہ کی بنیاد ڈالیں؟ (ترجمہ تفسیر الہام الرحمٰن ص 49 الجزء الثانی)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ کے سامنے اپنی صفائی میں جو دو باتیں فرمائی ہیں کہ میں اپنی قوم کے حالات سے جبھی تک باخبر تھا جب تک ان میں رہا، پھر جب تو نے مجھے موت دے دی تو پھر تو ہی ان کا نگران حال تھا۔ ان میں پہلی بات "ما دمت فیھم"، تو درست ہے مگر دوسری بات "فلما توفیتنی" سراسر غلط قرار پاتی ہے، کیونکہ قوم نصاریٰ میں سارا بگاڑ اور مشرکانہ خرابیاں تو اس دوران میں پیدا ہوئیں جب عیسیٰ علیہ السلام مبینہ طور پر آسمان پر اُٹھا لیے گئے، مگر آپ فرما رہے ہیں کہ یہ صورت حال "فلما توفیتنی" کے بعد پیدا ہوئی حالانکہ یہ مرحلہ تو ابھی پیش ہی نہیں آیا!

آپ کے جواب کو درست قرار دینے کی ایک ہی صورت ممکن ہے کہ "ما دمت فیھم" اور "فلما توفیتنی" کے درمیان کوئی فصل اور خلا موجود نہ ہو کہ جونہی موت واقع ہوئی "ما دمت فیھم" کا زمانہ ختم ہو گیا اور جونہی یہ زمانہ ختم ہوا "فلما توفیتنی" کے دور کا آغاز ہو گیا مگر بصورت دیگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جواب کا ایک جز وغلط بیانی پر محمول کرنا پڑے گا، جس کی جسارت ایک رسول برحق اور وہ بھی حق تعالیٰ کے روبرو ہرگز نہیں کر سکتا!

زیر نظر آیت کا آخری حصہ بھی وَالسَّلَامُ عَلَیَّ ...... الخ (اور مجھ پر سلام ہو جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن میں زندہ کر کے اُٹھایا جاؤں گا، یہ ہیں عیسیٰ ابن مریم اور حق بات یہی ہے جس میں یہ لوگ جھگڑ رہے ہیں۔) بڑا معنی خیز ہے کہ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی کے لیے بھی انہی معروف مراحل کا ذکر کیا ہے جن سے ہر خاص و عام انسان گزرتا ہے یعنی پیدائش، موت اور حیات بعد الموت مگر "رفع الی السماء و نزول"

کے خصوصی مرحلے کا ذکر تو کیا اس کے لیے کوئی معمولی سا اشارہ بھی نہیں کیا حالانکہ ان کی زندگی کا یہ مبینہ مرحلہ عام انسانی زندگی کے معروف مراحل سے کہیں برتر خصوصیات و امتیازات کا حامل تھا مگر چونکہ یہ مرحلہ فی الحقیقت پیش ہی نہیں آیا اور نہ آئے گا تو آپ ایک غلط اور انہونی بات کا ذکر کیسے فرما سکتے تھے؟

اور سورۂ آل عمران میں جو یہ کہا گیا ہے وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ o (۴۹) تو یہ بھی اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی طرح "کافۃً للناس" تمام بنی نوع انسان کے لیے عالم گیر نبوت نہ تھی بلکہ وہ ایک خاص قوم بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے، مگر ہماری روایت پرستی نے ان کی نبوت کو عالم گیر نبوت کا درجہ دے دیا۔

چند اشکال اور ان کے جوابات

جہاں تک اس دعوے کے اثبات کا تعلق ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ تو بحالت جسمانی آسمان پر زندہ اُٹھائے گئے اور نہ وہ دوبارہ زمین پر تشریف لائیں گے، ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کی متذکرہ آیات کے تائیدی بیانات سے اس کا اثبات پوری طرح ہو گیا ہے، البتہ قرآن کریم ہی کی بعض آیات سے اس ضمن میں جو چند اشکال پیش کیے جاتے ہیں ان کا رفع کرنا بھی نہایت ضروری ہے:

1- اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ کہی جاتی ہے کہ سورۂ آل عمران کی آیت نمبر 46 میں کہا گیا ہے کہ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ "اور لوگوں سے کلام کریں گے، گہوارے میں اور پختہ عمر میں اور شائستہ لوگوں میں سے ہوں گے۔" ہم نے لفظ "کَھْلًا" کا ترجمہ 'پختہ عمر' کیا ہے، شاہ رفیع الدینؒ نے اس کا ترجمہ 'ادھیڑ عمر' اور مولانا اشرف علی تھانویؒ نے 'بڑے ہو کر' کیا ہے، شاہ عبدالقادرؒ نے موضح القرآن میں تحریر فرمایا ہے کہ منصب رسالت پر فائز ہونے کے بعد لوگوں کے سامنے ایسی ہی باتیں کریں گے جیسی گہوارے میں کی ہیں، یعنی توحید و رسالت کی تبلیغ فرمائیں گے۔ مطلب و مفہوم کے اعتبار سے ان ترجموں میں کوئی فرق نہیں ہے،

کیونکہ کہولت کی عمر بہ اعتبار لغت تیس سے پچاس سال تک ہوتی ہے اور جو لوگ بعض ضعیف روایات کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی آسمان پر اُٹھا لیے گئے تھے اور جب دوبارہ زمین پر تشریف لائیں گے تو اس وقت پختہ عمر میں لوگوں سے کلام کریں گے، ان کا یہ دعویٰ محض بے دلیل ہے، کیونکہ منصب رسالت پر فائز ہونے کی عمر پختہ عمر ہی ہوتی ہے، عنفوان شباب یا آغاز جوانی میں یہ ذمہ دارانہ منصب کسی ناپختہ ذہن وعمر کے انسان کو یونہی نہیں سونپ دیا جاتا۔

-2 اس ضمن میں سورۂ زخرف کی یہ آیت بھی پیش کی جاتی ہے وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ O ''اور وہ (عیسیٰ علیہ السلام) قیامت کی ایک نشانی ہے تو تم اس (قیامت کے آنے) میں شک نہ کرو اور میری پیروی اختیار کرو کہ سیدھا راستہ یہی ہے۔'' اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی بتایا گیا ہے، تو اس حقیقت سے کون انکار کر رہا ہے کہ جو بڑے بڑے معجزات بحکم خداوندی ان سے ظہور پذیر ہوئے مثلاً بے جان اجسام میں جان ڈالنا، مردوں کو ''قم باذن اللّٰہ '' کہہ کر زندہ اُٹھا کھڑا کرنا وغیرہ وغیرہ تو یہ ساری باتیں قیامت ہی کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اسی دن تمام اگلے پچھلے مُردے زندہ ہو کر قبروں سے باہر نکلیں گے، مگر آسمان پر زندہ اُٹھایا جانا یا زمین پر اُترنا قیامت کی کون سی نشانی ہے جس کی بنا پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قیامت کی نشانی قرار دیا جا رہا ہے؟

-3 اس کے بعد سورۂ نساء کی آیت وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًاO ''اور اہل کتاب میں سے کوئی نہیں جو اس کی موت سے قبل اس کی تصدیق نہ کرلے گا اور قیامت کے دن وہ ان پر شہید (گواہ) ہوگا۔'' سے بھی یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ اہل کتاب میں سے ہر شخص اپنی موت سے پہلے ان پر یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے گا اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوں گے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اکثر مترجمین نے ''اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ '' کا ترجمہ ''کوئی نہیں جو اپنی موت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لائے گا۔'' کیا ہے جو درست نہیں ہے کیونکہ متن قرآن میں حضرت علیہ السلام کا نام مذکور نہیں ہے بلکہ ''لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ''میں دونوں جگہ ضمیر واحد غائب مذکر لائی گئی ہے۔ اسی طرح ''وَيَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ''میں ''يَكُوْنُ'' واحد غائب مذکر کا صیغہ آیا ہے لہٰذا تینوں مقامات پر ضمائر واحد غائب مذکر اور صیغۂ واحد غائب مذکر کے مطابق ترجمہ کرنا چاہیے تھا تاکہ کلام کے سیاق وسباق سے ضمیر کے مرجع کا تعین کیا جا سکے۔

یہاں آغازِ کلام يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ ......الخ سے ہو رہا ہے کہ (اے محمدؐ) اہل کتاب آپ سے کہتے ہیں کہ آپ آسمان سے ان پر ایک کتاب نازل کرا دیں (تو پھر یہ آپ کو اور قرآن کو مان لیں گے) اس سے پہلے یہ لوگ موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بڑی بات کہہ چکے ہیں کہ ہمیں حق تعالیٰ کا کھلم کھلا دیدار کرا دو۔

موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل کی ہرزہ سرائیوں کے علاوہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان کے غلط اور بے بنیاد دعووں کا تذکرہ جو خاصا طویل ہے، جملۂ معترضہ کے طور پر کیا گیا ہے (اور جملۂ معترضہ کی طوالت کسی قدر بھی ہو سکتی ہے) اس کے بعد آیت زیر نظر میں روئے سخن پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی جانب لوٹ آیا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جس پر اس کی موت سے پہلے قرآن یا صاحب قرآن کی صداقت و حقانیت کی تصدیق نہ ہو جائے گی۔ یعنی قرآن کریم میں جو باتیں ان کے سابقہ کردار و اعمال کے بارے میں بیان کی گئی ہیں ان کی تصدیق تو ہر اہل کتاب کو ہو ہی چکی ہے اور ان کی موجودہ روش کے بارے میں جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے کیونکہ وہ بھی وقوع پذیر ہوتا جا رہا ہے، اس لیے امر واقعی کے طور پر قرآن اور صاحب قرآن کی صداقت تو ان پر بخوبی واضح ہو چکی ہے اور ہوتی جا رہی ہے مگر یہ اور بات ہے کہ یہ لوگ اپنے تمرد وسرکشی کے باعث زبان سے اس حقیقت نفس الامری کا اعتراف وقرار نہ کر پائیں اور خیال رہے کہ یہاں ''مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ '' سے صرف مدینہ میں اُس وقت کے آباد اہل کتاب مراد ہیں کیونکہ یہی لوگ آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف

سوالات کرتے تھے، ساری دُنیا کے یا قیامت تک آنے والے اہل کتاب مراد نہیں ہیں۔

تو ان اہل کتاب کی تصدیق بالقرآن یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر یقین کی کیفیت بالکل ایسی تھی جس طرح کوئی مجرم یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس نے یہ جرم واقعی کیا ہے عدالت مجاز کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف محض اس لیے نہیں کرتا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو پھر وہ سزا سے نہیں بچ سکے گا۔ تو اسی طرح ان اہل کتاب پر بھی واقعاتی شواہد کی بنا پر قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت وصداقت تو ثابت ہو چکی ہے، یہ اور بات ہے کہ یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے اس کا زبانی اعتراف نہیں کرتے۔ اس تصریح کے مطابق ’’وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ‘‘ کا مطلب یہ ہوگا کہ ان اہل کتاب (یعنی مدینہ اور جوار مدینہ میں آباد اہل کتاب) میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنی موت سے پہلے اس (قرآن یا صاحب قرآن) کی تصدیق نہ کرے گا۔

اور ہمارے اس خیال کی تائید کہ ’’لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ‘‘ سے قرآن یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا مراد ہے، اسی مقام پر چند آیات کے بعد آیت نمبر (166) سے بھی ہو رہی ہے جس میں فرمایا گیا ہے ’’لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ○ لیکن حق تعالیٰ اس کتاب کے ذریعہ جس کو آپ کی طرف نازل کیا ہے اور اپنے پورے علمی کمال کے ساتھ نازل کیا ہے، گواہی دے رہے ہیں اور ملائکہ بھی گواہی دے رہے ہیں، اور اللہ ہی کی گواہی کافی ہے!‘‘ کہ ’’يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ‘‘ سے ’’وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا‘‘ تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور ایمان بالقرآن ہی کا بیان مذکور ہے۔

مولانا سندھی کی تفسیر

مولانا عبیداللہ سندھی نے اپنی تفسیر ’’الہام الرحمٰن‘‘ میں سورۂ نساء کی مذکورہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ’’اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا‘‘ میں، تمام ضمیروں کا مرجع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

’’کیا ساری دنیا کے اہل کتاب رسول اللہ سے آکر پوچھنے

لگے یا مدینہ منورہ کے چند اہل کتاب؟ آخر الذکر بات ہی درست ہے کیونکہ ساری دُنیا تو آ نہیں سکتی، یہ آیت صرف ان کے حق میں ہے، ان اہل کتاب میں سے ایک آدمی بھی نہیں ملے گا جو رسول اللہ پر ایمان نہ لے آئے گا، اس ایمان کا مطلب یہ ہے کہ جبراً حکم مانیں گے، کسی کو قتل کر دیا جائے گا اور کسی کو نکال دیا جائے گا۔ یہ سب رسول اللہ کی وفات سے پہلے ہوگا۔ اب تو یہ لوگ باتیں پوچھ پوچھ کر شک ڈالتے ہیں مگر وقت آنے والا ہے جب ان کو رسول اللہ کی باتوں کو جبراً ماننا پڑے گا۔ بعض مفسرین نے اس کا ترجمہ واقعی قبل موت النبی کیا ہے اور قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر شہادت دیں گے۔‘‘ (امالی مولانا سندھیؒ)

مولانا سندھیؒ کی تعبیر وتشریح کے مطابق تمام ضمیروں کا مرجع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ’’وَيَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا‘‘ میں ’’يَكُوْنُ‘‘ کا صیغہ بھی آپ ہی کے لیے آیا ہے، یعنی مدینہ میں آباد اہل کتاب کا ہر فرد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قبل آپ کا حکم ماننے پر مجبور ہو جائے گا۔

مولانا عاشق الٰہیؒ میرٹھی کی تائید

مولانا سندھیؒ اسی آیت کی تفسیر کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ:

’’سب سے پہلے عزیز احمد نے ہمیں بتایا کہ مولوی عاشق الٰہیؒ میرٹھی (دیوبندی) نے اس کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ ’’قَبْلَ مَوْتِهٖ‘‘ کی ضمیر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف راجع ہے، دیکھا تو ہماری آنکھیں کھل گئیں اور اب معاملہ بالکل صاف ہو گیا، ’’ایمان‘‘ کا ترجمہ ہماری اپنی تحقیق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا پر قرآن کی حکومت قائم کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ان کے مرکز میں جو حجاز میں ہے کوئی طاقت زندہ نہیں رہ سکتی، ان کے حکم کو مانے بغیر حجاز میں کوئی طاقت رسولؐ کی زندگی میں زندہ رہے تو کام ہی کیا ہوا۔‘‘ تم کلام الامام (الہام الرحمٰن من امالی مولانا عبیداللہ سندھیؒ) کو ہماری بیان کردہ تعبیر اور مولانا سندھیؒ کی تعبیر وتشریح میں فرق صرف اتنا ہے کہ ہم نے ’’لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ‘‘ کی ضمیر کا مرجع رسول اللہؐ اور کتاب اللہ دونوں کو محتمل مانا ہے اور ’’قَبْلَ

مـوتـــہ'' کی ضمیر کے مرجع کا تعین عام مفسرین کی تعبیر کے مطابق اہل کتاب پر کیا ہے، مگر ان تعبیرات میں کوئی خاص فرق نہیں ہے جبکہ اہل کتاب سے مراد ہم بھی عہد رسالت کے انہی اہل کتاب کو لے رہے ہیں جو مدینہ یا جوار مدینہ میں قیام پذیر تھے۔ تو یہ سب اہل کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قبل آپؐ کی رسالت اور قرآن کی صداقت کو کسی عنوان سے تسلیم کرلیں گے یا خود اپنی موت سے پہلے ایسا کریں گے، نتیجہ کے اعتبار سے ان دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جہاں تک قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بجائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کے اثبات کا تعلق ہے تو ہمارا نقطۂ نظر بھی وہی ہے جو مولانا سندھیؒ نے بیان کیا ہے اور ہمارے خیال میں مولانا سندھیؒ کی پوری تعبیر کے قبول کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، کیونکہ یہ تعبیر قرآن کی کسی آیت کے معارض نہیں ہے جبکہ ''اپنی موت سے پہلے تمام اہل کتاب کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں خود قرآن کی تصریحات کے منافی ہے، اور حقیقت حال کے بھی خلاف ہے۔

تمام اہل کتاب ایمان نہیں لا سکتے

خیال رہے کہ زیر نظر آیت میں ''ایمان'' سے حقیقی ایمان مراد نہیں ہے کیونکہ یہ بات خارج از امکان ہے کہ تمام اہل کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن کریم یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں سے کسی پر بھی صدقِ دل کے ساتھ ایمان لے آئیں اور اگر یہ صورت قربِ قیامت کے وقت پیش آئے گی جیسا کہ باور کیا جاتا ہے تو ''رفع الی السماء'' سے قربِ قیامت تک ہزار ہا ہزار سال کی درمیانی مدت میں مرنے والے دُنیا بھر کے اہل کتاب پر اس کا اطلاق کیسے درست ہوگا؟

یقین و تصدیق کے بھی مختلف درجات ہوتے ہیں لیکن تصدیق و یقین کی ہر ذہنی کیفیت کو حقیقی ایمان کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، ایک یقین محض علم کے درجہ میں ہوتا ہے جسے ''علم الیقین'' کہتے ہیں اور یہاں اسی درجے کے ایمان و یقین کی بات ہورہی ہے جو صرف علم کی حد تک ہوگا کہ قرائن و شواہد کی روشنی میں یہ لوگ اپنی موت سے قبل قرآن کی حقانیت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے معنی برحق ہونے کی تصدیق ضرور کرلیں گے اور اگر اس ایمان کا اثبات حضرت

عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کے ساتھ کیا جاتا ہے تو یہ ایک امر محال اور بعید از قیاس بات ہوگی، البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کی صداقت کی تصدیق کسی نہ کسی عنوان سے انہیں ضرور ہوجائے گی مگر اس کے باوجود حقیقی ایمان کی دولت سے محروم ہی رہیں گے، کیونکہ قرآن کریم میں جابجا ایمانِ حقیقی کی جو تعریف بیان کی گئی ہے وہ ان کی اس باطنی کیفیت سے بہت مختلف ہے۔

تمام اُمتوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی شہید ہوں گے

اس تناظر میں وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ''اور قیامت کے دن وہ ان پر شہید ہوگا'' کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی قیامت کے دن ان (اہل کتاب) پر گواہ ہوں گے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شہید ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ خود بقول ان کے ان کی شہادت کا زمانہ ''مَا دُمْتُ فِيْهِمْ'' تک تھا جبکہ نصاریٰ نے شرک و گمراہی کی روش اس زمانے میں اختیار کی جو ''مَا دُمْتُ فِيْهِمْ'' کے بعد شروع ہوا۔ البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت بہر صورت قائم رہتی ہے، کیونکہ آپ کی رسالت تمام بنی نوع انسان کے لیے ہے تو آپ کی شہادت بھی سب کے لیے یقینی ہوگی جیسا کہ حق تعالیٰ نے سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۱۴۳ میں ارشاد فرمایا: ''وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط'' اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک ایسی جماعت بنادی ہے جو عدل پر (قائم) ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔''

حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے موضح القرآن میں ''امت وسط'' کی یہ تعریف بیان کی ہے کہ ''یہود و نصاریٰ کسی کو مانتے ہیں، کسی کو نہیں مانتے ہیں جبکہ مسلمان ساری آسمانی کتابوں اور رسالتوں کو مانتے ہیں۔'' تو یہ اُمت وسط یعنی صفتِ عدل پر قائم اُمت قرار پائی اور شہادت اسی کی قبول کی جاتی ہے جو صفت عدل سے متصف ہو لہٰذا آپؐ کی اور آپ کی اُمت ہی کی گواہی تمام انسانوں کے لیے عام ہوگی جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت ''مَا دُمْتُ فِيْهِمْ'' کے بعد ختم ہوگئی۔

اس شہادت سے مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ قیامت کے دن ہر نبی سے اس کی اُمت

کے سامنے پوچھیں گے کہ تم نے میرا حکم ان تک پہنچایا تھا؟ ہر نبی اس کا اثبات میں جواب دے گا پھر جب اس کی اُمت سے پوچھا جائے گا تو وہ کہے گی کہ ہمارے پاس تو تیرا کوئی رسول یا ڈرانے والا نہیں آیا۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت سے ہر نبی کی تصدیق کی جائے گی۔ چنانچہ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن حضرت نوح علیہ السلام بلائے جائیں گے، پھر ان سے کہا جائے گا کہ تم نے پہنچا دیا تھا؟ تو وہ کہیں گے کہ ہاں۔ پھر ان کی قوم بلائی جائے گی اور اس سے پوچھا جائے گا کہ تم کو نوحؑ نے ہمارا حکم پہنچا دیا تھا؟ تو وہ کہے گی کہ ہمارے پاس تو نوحؑ یا کوئی بھی ڈرانے والا نہیں آیا۔ اس پر نوحؑ سے کہیں گے کہ تمہارا گواہ کون ہے؟ تو وہ کہیں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی اُمت۔ فرمایا: یہ مطلب ہے اُمَّةً وَّسطاً الآیه کا، پھر فرمایا: وسط کہتے ہیں عدل کو۔ سو تم نوحؑ کے لیے ''بلاغ'' کی گواہی دو گے اور میں تم پر گواہی دوں گا۔''
(رواہ بخاری واحمد ونسائی وابن ماجہ)

قرآن کریم کی متذکرہ صراحت اور مذکورہ روایت کی وضاحت سے آپؐ کا اور آپؐ کی اُمت کا تمام امم سابقہ پر گواہ ہونا ثابت ہے۔ لہٰذا آیت زیر نظر میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی گواہی کا ذکر ہے۔

آنحضرتؐ کی بعثت حضرت عیسیٰؑ کی وفات کے بعد ہوئی

حرف آخر کے طور پر سورۃ الصّف کی آیت نمبر 6 پر نظر ڈال لیجیے جس میں ارشاد ہو رہا ہے:

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰۃِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُہٗٓ اَحْمَدُ.

اور جب کہا عیسیٰ (علیہ السلام) ابن مریمؑ نے کہ اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں کہ مجھ سے پہلے جو

(تورات) آچکی ہے میں اس کی تصدیق کرنے والا ہوں اور میرے بعد جو ایک رسول آنے والے ہیں، جن کا نام احمدؐ ہوگا، میں ان کی بشارت دینے والا ہوں۔

اس آیت میں یَاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اس اَمر پر دلیل قطعی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ہوئی اور اگر وہ ابھی تک آسمان پر بقید حیات موجود ہیں تو یَاْتِیْ مِنْ بَعْدِی (جو میرے بعد آئیں گے) کا بیان بالکل غلط اور خلافِ واقعہ ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ ابھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کا زمانہ شروع ہی نہیں ہوا اور بلحاظ عربیت حدیث لا نبی بَعْدِی میں لفظ ''بَعْدِی'' کا جو مطلب ہے یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی میں بھی اس لفظ کا وہی مطلب ہونا چاہیے اور اگر یہ مطلب لیا جائے کہ مِنْ بَعْدِی سے مراد رفع الی السماء کا زمانہ ہے تو زمین پر دوبارہ تشریف آوری اور موجودگی کے وقت جب وہ خود اور تمام مسلمان اس فقرہ کی تلاوت کریں گے تو کیا اس وقت یہ سمجھا جائے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طبعی وفات کے بعد بھی کوئی پیغمبر آنے والے ہیں جن کا نام احمد ہوگا؟

اثباتِ حیات ونزول مسیحؑ پر چند اشکال

حیاتِ مسیحؑ اور نزولِ مسیحؑ کے عدم اثبات پر جو اشکال وارد ہو سکتے تھے یا وارد کیے گئے ہیں، ہم نے کم وبیش سب ہی کے جواب تحریر کر دیے ہیں لیکن ان کے اثبات پر از روئے قرآن جو زبردست اشکال پیدا ہوتے ہیں ہماری فہم ناقص میں تو ان کا کوئی مناسب ومعقول جواب ممکن نہیں ہے، لیکن اگر ان اشکالات کا کوئی جواب ہو سکتا ہے تو اربابِ علم وبصیرت سے ہماری درخواست ہے کہ ہمیں از راہ کرم اس سے ضرور مطلع فرمایا جائے تا کہ ہم اپنے نقطۂ نظر کی اصلاح کر لیں۔

1- بلا تفریق وعقیدہ ومسلک مسلمانوں کے تمام فرقوں کا اس اَمر پر اتفاق ہے کہ قرآن کریم از اوّل تا آخر کلامِ الٰہی ہے اور اس کا ہر حکم اور ہر بیان یومِ نزول سے تا قیامت دلیل وحجت ہے، اس میں جو بات بھی بیان کر دی گئی ہے اس کی صحت وقطعیت کے بارے میں کوئی معمولی سا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا!

تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ الیه سے یہ مراد لی جاتی ہے

که ''حق تعالیٰ نے انہیں بحالتِ جسمانی اپنی طرف زندہ آسمان پر اُٹھالیا'' اور ہمارے عقیدہ کے مطابق وہ دوبارہ زمین پر تشریف لائیں گے، تو ان کی زمین پر موجودگی کی حالت میں جب وہ بقید حیات ہوں گے اور مہدیٔ آخرالزمان کے ساتھ مل کر خروج دجال جیسے فتنوں کا مقابلہ اور ان کا استیصال فرما رہے ہوں گے، اُس وقت قرآن کریم کے اس جملے بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ الیه کا کیا مطلب لیا جائے گا؟ کیونکہ اس وقت قرآن تو کہہ رہا ہوگا کہ ''اللہ نے انہیں اپنی طرف آسمان پر اُٹھالیا ہے''، مگر وہ بہ نفسِ نفیس اور بقیدِ حیات لوگوں کے درمیان موجود ہوں گے!

اگر اس جملے بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ الیه سے اس وقت رفع الی السماء کا اثبات ہوسکتا ہے تو ان کی دوبارہ زمین پر تشریف آوری اور موجودگی کی حالت میں اسی جملۂ واحدہ سے اس کا اثبات کیوں نہیں ہوگا؟ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰهِ (اللہ کے کلمات میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں) تو پھر یہ اتنی بڑی تبدیلی کیسے ممکن ہوجائے گی کہ گزشتہ دو ہزار سال کی مدت سے تا ایں دم اور نہ جانے آئندہ مزید کتنے ہزار سال تک تو اس جملے کا یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ ''حق تعالیٰ نے انہیں اپنی طرف آسمان پر اُٹھالیا ہے''، مگر جب وہ دوبارہ زمین پر تشریف لائیں گے اور نہ معلوم کب تک قیام فرما رہ کر کتنے فتنوں کا استیصال فرمائیں گے اور دینِ اسلام کو تمام ادیانِ عالم پر حقیقی غلبہ دلائیں گے تو اس ساری مدت میں اس کا مطلب یکسر تبدیل ہوجائے، پھر یا تو ہمیں قران کے ان جملوں بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ الیه ، وَرَافِعُکَ اِلَیَّ کو قرآن کی دفتین سے خارج کرنا ہوگا، ورنہ کم از کم انہیں منسوخ الحکم تو قرار دینا ہی پڑے گا مگر یہ دونوں صورتیں اس لیے ممکن نہ ہوں گی کہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (بے شک ہم نے ہی اس قرآن کو نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) اور اسی کا یہ کہنا ہے کہ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا. ''ہم جو کسی آیت کو منسوخ کردیتے ہیں یا اسے بھلا ہی دیتے ہیں تو ہم اس سے بہتر یا اس جیسی ہی کوئی (دوسری) آیت (اس کی جگہ) لے آتے ہیں'' تو کسی آیت یا اس کے حکم کو منسوخ کرنے کا معاملہ بھی حق تعالیٰ نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے اور کسی انسان بلکہ اپنے رسولؐ تک کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ قرآن کی کسی آیت یا اس کے حکم کو منسوخ کرے تو اس صورت میں ہمیں قرآن کے ان جملوں کی یا تو وہی تعبیر قبول کرنی پڑے گی،

جو ہم نے پیش کی ہے کہ ''حق تعالیٰ نے بارگاہِ خداوندی میں ان کے درجات بلند فرمادیئے''، ورنہ بصورتِ دیگر ہمیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمین پر نزول بلکہ ان کے وجودِ مسعود ہی کی تکذیب کرنی پڑے گی، کیونکہ بیک وقت زمین اور آسمان پر دونوں جگہ پر ان کی موجودگی ممکن الوقوع نہیں ہوسکتی کہ ہم نے انہیں صرف پیغمبر ہی تسلیم کیا ہے عیسائیوں کی طرح الوہیت کا درجہ نہیں دیا۔

پھر اس سے بھی عجیب تر صورتِ حال اس وقت پیش آئے گی جب زمین پر آنے کے بعد وقتِ موعود پر ان کی فطری موت واقع ہوگی تو قرآن اس وقت بھی پکار پکار کر یہی کہہ رہا ہوگا کہ ''اللہ نے انہیں اپنی طرف زندہ آسمان پر اُٹھالیا''، مگر فی الحقیقت ان کی طبعی موت واقع ہوچکی ہوگی بلکہ زمین کے کسی گوشے میں ان کا پر شکوہ مقبرہ بھی تعمیر ہوچکا ہوگا، لہٰذا ہم قرآن کو تو جھٹلا نے سے رہے۔ چار و ناچار ہمیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول، ان کے وجودِ مسعود اور زمین پر موجود ان کے روضۂ مبارک ہی کی تکذیب کرنی پڑے گی کیونکہ قرآن کے ایک ہی جملہ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ الیه کا مطلب قبلِ نزول من السماء تو یہ ہو کہ ''اللہ نے انہیں زندہ آسمان پر اُٹھالیا'' اور پھر طبعی موت کے بعد اسی جملے کا مطلب یہ ہوجائے کہ ''اللہ نے انہیں موت دے کر اپنی طرف اُٹھا لیا''، اللہ کا کلام نہ ہوا دورِ حاضر کے کسی لیڈر کا سیاسی بیان ہوگیا کہ جب جو چاہا مطلب نکال لیا!

2- اسی طرح حق تعالیٰ تو سورۂ آلِ عمران کی آیت نمبر 55 میں فرما رہے ہیں کہ ''میں تمہارے متبعین کو گروہِ منکرین پر روزِ قیامت تک غلبہ عطا کرنے والا ہوں'' مگر ہماری تفسیری تعبیرات و روایات یہ ثابت کررہی ہیں کہ تمام اہلِ کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر قیامت سے قبل ہی ایمان لے آئیں گے۔ تو قرآن کے مذکورہ بیان کا تقاضا تو یہ ہوگا کہ وہ منکرین (یہودیوں) اور حضرت علیہ السلام کے متبعین (نصاریٰ) کے مابین تا قیامِ قیامت تصادم و آویزش کا سلسلہ جاری رہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے اپنے دشمنوں پر وقوعِ قیامت تک غالب رہیں مگر ہم قرآنی فرمودات کے علی الرغم یہ دعویٰ کررہے ہیں کہ تمام اہلِ کتاب حلقہ بگوش اسلام ہوجائیں گے اور یہ سب کچھ قیامت سے بہت پہلے ہوجائے گا۔ تو اندریں صورت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین کے یہودیوں پر قیامت تک غالب رہنے کی کیا شکل ہوگی؟ جبکہ یہ دونوں گروہ ایمان لانے کے بعد ملتِ واحدہ بن چکے ہوں گے تو گروہ غالب کون ہوگا اور مغلوب

کسے کہا جائے گا؟

3- پھر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، قرآن کھلے بندوں یہ اعلان کر رہا ہے کہ وَ اَلْقَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ ؕ اور ہم نے ان کے درمیان قیامت تک دشمنی اور بغض ڈال دیا، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمام اہل کتاب کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کے بعد روزِ قیامت تک ان کے مابین بغض وعداوت کی آخر کیا شکل ہوگی، قرآن کو تو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ اس کی صداقت وحقانیت پر ہمارے دین وایمان کی بنیاد قائم ہے البتہ ہم آیاتِ قرآنی کی ان تعبیرات یا ایسی روایات ہی کو غلط قرار دے سکتے ہیں جو قرآنی تصریحات کے سراسر منافی ہیں۔

کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں؟

(شیخ الازہر علامہ محمود شلتوت/مترجم: سید نصیر شاہ میانوالی)

(ذیل کا مضمون شیخ الازہر، شیخ الاسلام، مفتی الدیار المصریہ العلامہ الاستاذ محمود شلتوت صاحب کے ایک فاضلانہ فتویٰ کا ترجمہ ہے۔ یہ فتویٰ، کتاب الفتاویٰ مطبوعہ از ہر دسمبر 1959ء کے صفحات 52 تا 58 پر درج ہے)

جامع ازہر کی مجلس علما کو مشرق وسطیٰ کی فوجی قیادت عامہ کے ایک ممتاز رُکن جناب عبدالکریم خان کی طرف سے ایک استفتا موصول ہوا ہے، جس کی عبارت درج ذیل ہے:

استفتا

1- کیا کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہؐ کی تصریحات کی رو سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات پا گئے ہیں؟

2- زید اگر عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ ہونے کا منکر ہے تو علمائے کرام کا اس پر کیا فتویٰ ہے؟

3- نیز ایک شخص اگر ان کے دوبارہ نزول کا منکر ہو تو اس کے متعلق کیا فیصلہ ہے؟ کیا اسے کافر کہا جا سکتا ہے؟

جامعہ ازہر کی مجلس علما نے اس سوال کا جواب دینے کا فریضہ مجھ پر عائد کیا، میں نے اسی وقت استفتا کا جواب دیا تھا جو مصر کے معروف ماہنامہ الرسالة کی جلد نمبر 10 میں شائع ہو چکا ہے۔ وہاں سے بعینہٖ اس فتویٰ کو نقل کر کے مجموعۂ فتاویٰ میں شامل کیا جا رہا ہے۔

قرآن حکیم اور مسئلہ وفات عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انجام قرآن حکیم میں تین مختلف مقامات پر بیان ہوا ہے۔

1- سورۂ آل عمران میں خدائے قدوس کا ارشاد ہے:

فَلَمَّا اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْھُمُ الْکُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ ۚ وَاشْھَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○ رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاکْتُبْنَا مَعَ الشّٰھِدِیْنَ ○ وَ مَکَرُوْا وَ مَکَرَ اللّٰہُ ؕ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ ○ اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُطَھِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاَحْکُمُ بَیْنَکُمْ فِیْمَا کُنْتُمْ فِیْہِ تَخْتَلِفُوْنَ ○ (52:3 تا55)

پھر جب عیسیٰؑ نے ان سے کفر محسوس کیا تو فرمایا کون ہیں جو اللہ کے دین کے معاملہ میں میری مدد کریں؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے اور گواہ رہو کہ ہم فرماں بردار ہیں۔ اے ہمارے رب! ہم اس پر ایمان لائے جو تو نے نازل کیا اور ہم نے رسول کی اتباع کی، پس تو ہمیں گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ اور کافروں نے تدبیر کی اور اللہ نے بھی تدبیر کی اور اللہ سب تدبیر کرنے والوں سے اچھا ہے۔ جب اللہ نے فرمایا، اے عیسیٰ میں تجھے وفات دینے والا ہوں اور تجھے اپنی طرف بلند کرنے والا ہوں اور تجھے ان کے الزام سے پاک کرنے والا ہوں جو کافر ہیں اور جنہوں نے تیری پیروی کی، انہیں ان پر جنہوں نے انکار کیا قیامت کے دن تک فوقیت دینے والا ہوں۔ پھر میری طرف تمہارا لوٹ آنا ہے پس میں تمہارے درمیان ان باتوں میں فیصلہ کروں گا، جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔

2- دوسری جگہ سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ قَوْلِھِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ

اللّٰہِ ۚ وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْہِ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ ؕ مَا لَھُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْہُ یَقِیْنًا بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ۔ (157:4 تا158)

اور ان کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم اللہ کے رسول کو قتل کر دیا اور انہوں نے نہ اسے قتل کیا اور نہ اسے صلیب دی مگر وہ ان کے لیے اس جیسا بنا دیا گیا اور بے شک وہ لوگ جنہوں نے اس کے متعلق اختلاف کیا اس بارے میں شک میں ہیں ان کو اس کا کچھ علم نہیں، صرف گمان کے پیچھے چلتے ہیں اور انہوں نے اسے یقینی طور پر قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اسے اپنا قرب عطا فرمایا۔

3- تیسرے مقام پر سورۂ مائدہ میں ہے:

وَاِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰھَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَکَ مَا یَکُوْنُ لِیْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ ؕ اِنْ کُنْتُ قُلْتُہٗ فَقَدْ عَلِمْتَہٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَا اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِکَ اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ○ مَا قُلْتُ لَھُمْ اِلَّا مَا اَمَرْتَنِیْ بِہٖ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبَّکُمْ وَکُنْتُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْھِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْھِمْ وَاَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌ ○ (116:5 تا117)

اور جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ بن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ ”مجھے اور میری ماں کو خدا کے سوا معبود بنالو؟“ کہا: ”تو پاک ہے، مجھے کہاں زیبا تھا کہ میں وہ کہوں جس کا مجھے حق نہیں، اگر میں نے ایسا کہا ہوتا تو تجھے اس کا ضرور علم ہوتا۔ تو جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے، تو ہی غیب کی باتوں کا جاننے

والا ہے۔ میں نے ان سے کچھ نہیں کہا مگر وہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ
اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب اور تمہارا رب ہے اور میں ان پر گواہ تھا جب
تک کہ میں ان میں تھا، پھر تو نے مجھے وفات دے دی تو تُو ہی ان پر
نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔"

قرآن حکیم میں محض مذکورہ بالا تین مقامات پر حضرت مسیحؑ کے انجام کا ذکر ہوا ہے۔
سورۂ مائدہ کی آیت اس گفتگو کو بیان کرتی ہے جو محشر کے روز حضرت مسیحؑ اور حضرت مریمؑ کی عبادت کرنے والوں کی تردید میں ہوگی۔ سلسلۂ کلام میں ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسیح علیہ السلام کو مخاطب کر کے کہے گا کہ "کیا نصاریٰ کو تو نے ہی کہا تھا کہ وہ تیری اور تیری ماں کی عبادت اختیار کریں؟" مسیح علیہ السلام عرض کریں گے: "میرے خدا! تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں نے تیری توحید کا پیغام پہنچایا ہے۔ ہاں جب تک میں ان کے درمیان موجود رہا، ان کا نگران تھا، البتہ مجھے اپنی وفات کے بعد وقوع پذیر ہونے والے حالات کا علم نہیں۔"

اس آیت میں فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کے الفاظ صراحت کر رہے ہیں کہ مسیح کی "وفات" ہو چکی۔ یہاں اس اَمر کی قطعاً گنجائش نہیں کہ اس وفات سے مسیح علیہ السلام کے آسمان سے اُترنے کے بعد کی وفات مراد لی جائے، کیونکہ جو لوگ ہنوز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر زندہ گمان کرتے ہیں، ان کا بھی یہی خیال ہے کہ نزول کے بعد حضرت عیسیٰ کی وفات اس وقت ہوگی جب حق کا غلبہ ہوگا اور باطل اپنی شکست کی آواز بن کر رہ جائے گا۔ یہ وفات گویا قربِ قیامت کے وقت ہوگی، جس کے بعد متبعین مسیحؑ کے شرک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ آیت حضرت مسیحؑ اور ان کی قوم کے تعلق کی حد بندی کر رہی ہے، اس لیے ان لوگوں کو محیط نہیں ہو سکتی جو آخری زمانے میں ہوں گے کیونکہ وہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے لوگ ہوں گے نہ کہ مسیحؑ کی قوم کے۔

ایک اور طرح سے دیکھیے تو بھی یہ آیت حضرت مسیحؑ کی وفات کو قطعیت کے ساتھ ثابت کر رہی ہے کیونکہ اس آیت میں عیسائیوں کے عقائد بگڑنے کا زمانہ حضرت مسیحؑ کی وفات کے بعد بیان کیا گیا ہے اور چونکہ وہ نزولِ قرآن سے پہلے بگڑا ہوا تھا اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ

السلام کی وفات بھی نزولِ قرآن سے پیشتر ہو چکی تھی۔ بخاری شریف میں ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب قیامت کے روز میری اُمت کے بعض لوگ پکڑ کر دوزخ کی طرف لے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نہیں جانتا کہ انہوں نے تیرے بعد کیا کیا۔"

فَاَقُوْلُ كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ.

میں وہی بات کہوں گا جو عبد صالح (عیسیٰ علیہ السلام) نے کہی تھی: اور میں ان پر گواہ تھا جب تک میں ان میں رہا پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو تُو ہی ان پر نگہبان تھا۔

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الفاظ استعمال کرنا صاف بتاتا ہے کہ آپ کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُمت بھی ان کی وفات کے بعد بگڑی تھی اور اسی طرح آپؐ کی اُمت آپؐ کی وفات کے بعد بگڑے گی۔

تَوَفِّي کے معانی

ان تصریحات کے بعد لفظ توفی کے معانی پر غور کیجیے:

قرآن حکیم میں توفی کا لفظ بکثرت وفات کے معنوں میں وارد ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لفظ توفی سے موت کے معنی متبادر سمجھے جاتے ہیں اور جب تک اس لفظ کے ساتھ کوئی اور قرینہ ایسا نہ ہو جو کسی دوسرے معنی پر دلالت کرے یہ لفظ موت کے معنی کے بغیر کسی اور معنی میں استعمال ہی نہیں ہوتا۔ سورۂ سجدہ میں ہے:

قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ. (33:11)

کہہ: موت کا فرشتہ تمہاری روح قبض کرتا ہے جو تم پر مقرر کیا گیا ہے۔

سورۂ نساء میں ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ. (97:4)

جن لوگوں کے فرشتے جان قبض کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں۔

سورۂ انفال میں ہے:

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ. (50:8)

اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں۔

سورۂ انعام میں ہے:

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا. (41:4)

یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت آتی ہے تو اللہ کے بھیجے ہوئے اسے وفات دے دیتے ہیں۔

اسی طرح تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ، حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ، وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وغیرہ آیات میں توفی صراحت سے موت کے معنوں میں آیا ہے، اس لیے توفی کا کوئی اور مفہوم لینا خلافِ قاعدہ ہے۔ لغت میں بھی تَوَفَّاهُ اللّٰهُ کے معنی قَبَضَ رُوْحَه' لکھے گئے ہیں۔ سورۂ آل عمران کی آیت مذکورۃ الصدر میں يٰعِيْسٰٓى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ کے معانی کسی عربی دان سے پوچھیے، وہ صاف طور پر یہی مفہوم بیان کرے گا کہ ''اے عیسیٰ میں تجھے موت دوں گا۔'' یہ الگ بات ہے کہ وہ روایات کو مدنظر رکھ کر اس کا وہ عجیب وغریب مفہوم بیان کر ڈالے جس پر علم ماتم کرتا ہے اور عربیت سینہ پیٹتی ہے۔ خود بخاری شریف میں ابن عباسؓ نے اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ کے معنی کیے ہیں اِنِّيْ مُمِيْتُكَ (میں تجھے موت دوں گا)۔

رفعه اللّٰه اليه کے معانی اور روایات مضطربہ

سورۂ نساء کی آیت میں بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وارد ہوا ہے۔ اکثر مفسرین نے اس میں

رفع کی تفسیر آسمان کی طرف جانا کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی اور کو مسیحؑ کی شبیہ بنا دیا اور مسیحؑ کو جسم سمیت آسمان پر اُٹھا لیا۔ وہ وہاں زندہ ہیں، آخری زمانے میں اُتریں گے، سوروں کو مار ڈالیں گے اور صلیب توڑ دیں گے۔ مفسرین اس بارے میں اوّل تو ان روایات پر اعتماد کرتے ہیں جن میں دجال کے بعد نزولِ مسیحؑ کا ذکر ہے۔ یہ روایات مضطرب اپنے الفاظ اور معانی میں اس قدر مختلف ہیں کہ ان میں تطبیق ممکن نہیں، اس امر کی تصریح خود علمائے حدیث نے کی ہے۔ مزید برآں یہ وہب بن منبہ اور کعب الاحبار کی روایات ہیں، جو اہل کتاب میں سے مسلمان ہوئے تھے۔ علمائے جرح وتعدیل کے نزدیک ان راویوں کا جو درجہ ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مفسرین کی دوسری دلیل وہ روایت ہے جو ابو ہریرہؓ سے مروی ہے اور جس میں انہوں نے نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کی خبر دی ہے۔ اگر یہ حدیث صحیح تسلیم کر لی جائے، تب بھی یہ خبر واحد ہے اور علمائے اُمت کا اجماع ہے کہ خبر واحد سے نہ تو کوئی عقیدہ ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی امورِ غیبیہ کے بارے میں اس پر اعتماد کرنا درست ہے۔

مفسرین کی تیسری دلیل وہ بیان ہے جو حدیث معراج میں آیا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمانوں کی طرف صعود کیا اور یکے بعد دیگرے آسمانوں کو کھولتے گئے تو دوسرے آسمان پر حضرت عیسیٰؑ اور ان کے خالہ زاد بھائی حضرت یحییٰ علیہ السلام سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس دلیل کی عنکبوتیت خود اس بیان سے واضح ہے۔ تمام علما تسلیم کرتے ہیں کہ معراج میں حضورؐ بہت سے انبیا سے ملے اور یہ ملاقات محض روحانی تھی[1]۔ اگر جسمانی ہوتی تو ماننا پڑے گا کہ جس طرح حضرت عیسیٰؑ زندہ اُٹھا لیے گئے اسی طرح باقی انبیا بھی زندہ اُٹھائے گئے ہوں گے اور حضرت یحییٰ علیہ السلام تو خصوصاً زندہ اُٹھائے گئے ہوں گے کیونکہ وہ تو حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ ہی ملے تھے، تو کیا تمام انبیا کا پھر نزول ہوگا۔

یہاں مفسرین کی اس بات کو بھی مدنظر رکھیے کہ جب وہ رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ آیت قرآنی کا مفہوم بیان کرتے ہیں تو حدیث معراج سے استدلال کرتے ہیں۔ چونکہ معراج میں حضورؐ نے

[1] واضح ہو کہ قرآن میں معراج کا اشارہ تک بھی نہیں۔ اسریٰ کا ذکر سورہ بنی اسرائیل کی ابتدائی آیات میں ہے اور بس۔ (امتیاز)

عیسیٰ علیہ السلام کو دوسرے آسمان پر دیکھا اس لیے رفعہ اللہ الیہ کے معنی ہیں اللہ نے عیسیٰؑ کو آسمان پر اُٹھا لیا، لیکن جب حدیث معراج کے سلسلے میں ان سے کہا جاتا ہے کہ ممکن ہے دوسرے انبیا کی طرح عیسیٰ علیہ السلام سے بھی روحانی ملاقات ہوئی ہو تو وہ جھٹ کہہ دیتے ہیں، واہ جی! قرآن میں آچکا ہے بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ گویا اس طرح یہ لوگ جب حدیث کی تشریح کرتے ہیں تو اپنے مزعومہ معانی پر آیت کو دلیل گردانتے ہیں اور جب آیت کی تفسیر کرتے ہیں تو حدیث کے مزعومہ مفہوم کو بطورِ سند لاتے ہیں۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

رفع کی حقیقت

سورۂ آل عمران کی آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ اِلَیَّ، سورۂ نساء کی آیت بل رفعہ اللہ الیہ سے ملا کر پڑھیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت میں وفات کے بعد رفع کا جو وعدہ کیا گیا تھا، دوسری آیت میں اسی وعدہ کے پورا ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلی آیت میں وفات، رفع اور تطہیر کے وعدے تھے۔ اگرچہ دوسری آیت میں وفات اور تطہیر کا بیان نہیں، صرف رفع الی اللہ کا ذکر ہے۔ تاہم دونوں آیتوں میں تطبیق کے لیے ضروری ہے کہ ان تمام وعدوں کو یہاں بھی مدنظر رکھا جائے، پس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وفات دی، پھر رفع فرمایا اور انہیں کافروں کے الزامات سے معصوم ثابت کیا۔

ماضی قریب کے مشہور مفسر علامہ آلوسی نے مُتَوَفِّیْکَ کی جو متعدد تفسیریں بیان کی ہیں، ان میں سے واضح ترین یہی معنی ہیں کہ "میں تیری مدتِ عمر کو پورا کروں گا اور تجھے طبعی موت سے وفات دوں گا۔ تجھ پر کوئی ایسا شخص مسلط نہ ہوگا جو تجھے مقتول یا مصلوب کر سکے۔ مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ کا یہی مفہوم ہے، جو شخص قتل نہ ہو اور نہ ہی صلیب پر لٹکایا جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس کی موت سے بھی انکار کیا جائے۔ گویا آیۂ مذکورہ میں بطور کنایہ بتا دیا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دشمنوں کے قتل کرنے سے محفوظ رہے اور اپنی عمر پوری کر کے طبعی موت سے فوت ہوئے۔

یہ بات بالکل عیاں ہے کہ وفات کے بعد رفع سے صرف بلندیٔ درجات ہی مراد ہو سکتی ہے نہ کہ رفعِ جسمانی۔ بالخصوص جبکہ آیت میں متصل بعد وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ

كَفَرُوْا کا فقرہ موجود ہے، جو یہ ثابت کر رہا ہے کہ یہاں شرف واجتبا اور عظمت وتکریم کا ذکر مقصود تھا۔ قرآن حکیم میں لفظ رفع ان معانی میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ مثلاً وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ، نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَنْ نَشَاءُ، يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ ہم خود ہر روز دُعا میں بھی کہتے ہیں وَارْفَعْنِیْ (یعنی اے خدا مجھے بلند درجہ عطا فرما)۔ خدائے قدوس کا ایک صفاتی نام الرافع ہے۔ اس کا مفہوم ائمہ لغت نے یہی بیان کیا ہے کہ وہ اپنے اولیا کو اپنا قرب عطا فرما کر ان کے درجات بلند کرتا ہے۔ انسان کا کسی اونچی جگہ پر چلا جانا خدا کے نزدیک بلندی نہیں، نہ ہی خدا کوئی جسم ہے کہ وہ مقام بلند پر رونق افروز ہو۔

پس آیات رَافِعُكَ اِلَیَّ اور بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ میں وہی مفہوم ادا ہوا ہے جو آیات "اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" اور "عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ" وغیرہ میں مراد ہے۔ ان سب مقامات پر حفاظت، نگرانی اور مقدس پناہ میں داخل ہونے کے سوا اور کوئی مفہوم مراد نہیں لیا جا سکتا۔ پھر لفظ اَلَيْهِ میں نہ معلوم مفسرین آسمان کا لفظ کہاں سے گھسیٹ لاتے ہیں۔ بخدا کتاب اللہ کے واضح اور غیر مبہم اندازِ بیان پر یہ صریح ظلم محض ان قصوں اور روایتوں کی اتباع میں روا رکھا جا رہا ہے جن کی صحت پر یقینی طور پر تو کجا ظنی طور پر کوئی دلیل یا نیم دلیل بھی قائم نہیں۔

آیات کا واضح اور غیر مبہم مفہوم

علاوہ بریں حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف ایک رسول ہیں، ان سے پہلے کے سب رسول وفات پا چکے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ان سے دشمنی کی اور ان کے بارے میں ان کے بُرے عزائم نمایاں تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی قوت وحکمت سے انہیں فسادیوں کے شر سے محفوظ رکھا، اور دشمنوں کی خفیہ تدبیروں کو ناکام بنا دیا۔ یہی وہ مضمون ہے جو سورۂ آل عمران کی آیات میں بیان ہوا ہے۔ ایک دفعہ پھر ان آیات کا مطالعہ کیجیے تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے یہی کچھ بیان فرمایا کہ خدا کی تدبیر کافروں کے مقابلے پر نہایت قوی اور زبردست ہوتی ہے۔ اس لیے مسیحؑ کو محفوظ رکھنے کی الٰہی تدبیر کے سامنے یہود کا مسیحؑ کو قتل کرنے کا ناپاک منصوبہ اکارت گیا۔ آیات يٰعِيْسٰى اِنِّیْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا میں خدائے قدوس نے مسیحؑ کو بشارت دی تھی کہ وہ انہیں دشمنوں کے شر سے مامون

رکھے گا اوران کے ذلیل منصوبے ناکام بنادے گا۔ وہ انہیں پوری عمر کے بعد طبعی وفات دے گا اور ان کے درجات بلند کرے گا۔ اس طرح وہ لوگ جو عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب کی ذلیل موت دینے کے در پے تھے اپنی نامرادی کا ماتم کرتے رہ جائیں گے۔

صلیب کی موت کو وہ لوگ مسلمہ طور پر لعنت خیال کرتے تھے، کیونکہ استثنا 33 میں ہے: ''وہ جو مصلوب ہوتا ہے معلون ہوتا ہے'' اور گلیتون 13:3 میں پولوس کہتا ہے: ''لکھا ہے جو کوئی کاٹھ پر لٹکایا گیا سو لعنتی ہے''۔ چونکہ ''لعنت'' کے معنی ہیں خدا کی رحمت سے دُور ہو جانا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اے عیسیٰ! میں تجھے مقتول اور مصلوب نہیں ہونے دوں گا بلکہ تو طبعی موت سے وفات پائے گا۔ اور یہ لوگ جو گمان کرتے ہیں کہ تجھے صلیب دے کر وہ سر اونچا کر کے کہیں گے کہ دیکھو مسیحؑ اللہ کی رحمت سے دُور تھا (ملعون، معاذ اللہ) اسی لیے اسے صلیب کی موت نصیب ہوئی۔ انہیں بتادوں گا کہ میری رحمت سے دُور نہیں بلکہ میرا مقرب ہے۔'' (وَرَافِعُکَ اِلَیَّ)

ہر وہ شخص جس کا ذہن سلیم ان تمام روایات سے خالی ہو جنہیں بدقسمتی سے قرآن حکیم پر حکم تسلیم کر لیا گیا اور رب ذوالجلال کی اس سنتِ مقدسہ سے بھی واقف ہو جو انبیا کو دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے وقت ظہور میں آتی ہے، ان آیات کو پڑھتے وقت ان کا وہی مفہوم اخذ کرے گا جو ہم نے بیان کیا ہے۔

یہ عجیب نکتہ میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ مسیحؑ کو یہود کے درمیان سے آسمان پر لے جانے کو ''مکر'' (خفیہ تدبیر) کس طرح قرار دیا جاسکتا ہے اور پھر یہ کیوں کر کہا جاسکتا ہے کہ یہ ''مکر'' یہودیوں کے ''مکر'' سے بہتر تھا۔ حالانکہ وہ اس چیز کا سرے سے مقابلہ ہی نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ یہ انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ انسانی ''مکر'' کے مقابلہ میں اللہ کی خفیہ تدبیر پر ''مکر'' کے لفظ کا اطلاق اسی وقت جائز ہے جب وہ تدبیر عام عادت سے خارج نہ ہو اور انسانی ''مکر'' کے اسلوب پر نافذ ہو سکے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذْ یَمْکُرُبِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْیَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ وَیَمْکُرُوْنَ وَیَمْکُرُ اللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ ○ اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ:

عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر جانے کا منکر کافر قرار نہیں دیا جاسکتا

1- قرآن وحدیث میں ایسی کوئی سند موجود نہیں جس کی بنا پر یہ عقیدہ قائم کیا جاسکے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اُٹھائے گئے تھے، اب تک وہاں زندہ ہیں اور وہاں سے آخری زمانہ میں اُتریں گے۔

2- قرآن حکیم کی تصریحات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ محض یہی ہے کہ اللہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ انہیں عمر طبعی کے اختتام پر وفات دے گا، ان کے درجات بلند فرمادے گا اور انہیں کافروں کے برے عزائم سے محفوظ رکھے گا اور یہ وعدہ پورا ہو گیا ہے۔ حضرت مسیحؑ کے دشمن نہ انہیں قتل کر سکے ہیں نہ مصلوب، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدت پوری کر کے انہیں وفات دی اور اپنا قرب عطا فرمایا۔

3- جو شخص [illegible] علیہ السلام کے جسم سمیت آسمانوں پر اُٹھائے جانے، وہاں زندہ ہونے اور آخری زمانے میں نزول فرمانے سے انکار کرتا ہے، وہ کسی قطعی اور یقینی چیز سے انکار نہیں کرتا۔ لہٰذا اسے اسلام اور ایمان سے خارج قرار دینا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ اس پر ارتداد کا حکم لگانا کسی طرح درست نہیں بلکہ وہ مومن و مسلم ہے۔ جب وہ فوت ہو تو مسلمانوں کی طرف اس کا جنازہ پڑھنا چاہیے، اور اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا چاہیے۔ اللہ کے نزدیک تو اس کے ایمان میں کوئی شبہ نہیں: اِنَّ اللّٰہَ بِعِبَادِہٖ لَخَبِیْرٌ بَصِیْرٌ۔

چند اعتراضات وتنقیدات اور ان کے جوابات

مضمون کی تکمیل اور متذکرہ نقطۂ نظر پر شرح صدر کے باوجود قلب میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ پیش کردہ دلائل پر اگر مزید اعتراضات واشکالات وارد ہوسکتے ہیں تو کیوں نہ ان پر بھی سنجیدگی کے ساتھ غور کرلیا جائے اور اگر ان میں کچھ بھی وزن ہو تو اپنے موقف پر نظر ثانی کر لی جائے کہ یہ صورت یقیناً اقرب الی الصواب ہوگی۔ چنانچہ اپنے محدود حلقۂ تعارف میں کسی موزوں علمی شخصیت کی تلاش کے لیے نظر دوڑائی تو نگاہ انتخاب اپنے ایک قدیمی کرم فرما پر جا کر ٹھہر گئی جو ذی علم وذی استعداد عالم دین ہونے کے علاوہ ماشاء اللہ صاحب درس وافتا اور شہر کی مرکزی جامع مسجد کے خطیب بھی ہیں اور اپنی ان خصوصیات کی بنا پر علمی حلقوں میں عزت وتکریم کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنا تحریر کردہ مضمون بغرض تنقید وتبصرہ آں محترم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مولانا موصوف نے از راہِ کرم مضمون کا مطالعہ فرمانے کے بعد پہلی فرصت میں اپنی عالمانہ تنقیدات سپرد قلم فرما کر اصل مسودہ کے ساتھ مجھے بھجوا دیں۔ ان کے مطالعے سے مجھے اپنے حسنِ انتخاب پر اطمینانِ قلبی کے ساتھ دلی مسرت بھی ہوئی، کیونکہ یہ تنقیدات اظہارِ اختلاف کے باوجود نہایت شائستہ انداز میں متانت وسنجیدگی کے ساتھ تحریر کی گئی تھیں اور پھر ان سے میرا اصل مدعا بھی پورا ہو گیا کہ ان کے نتیجہ میں موضوع کے وہ پہلو بھی سامنے آ گئے جو کسی وجہ سے زیر بحث نہ آ سکے تھے۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد مناسب ہوگا کہ مولانا کی تنقیدات اور ان کے وہ جوابات جو میں نے ان کی خدمت میں پیش کیے، کسی تبصرہ کے بغیر من وعن نقل کر دیے جائیں تاکہ قارئین اصل مضمون، اس پر کیے گئے اعتراضات اور ان کے جوابات کے مطالعے کے بعد خود ہی کوئی رائے قائم کر سکیں۔

مولانا موصوف کا علمی تعارف تو ہو ہی گیا ہے۔ شخصی تعارف کی اس لیے ضرورت نہیں

کہ ذاتیات کو منظر عام پر لا کر کسی کا علمی تفوق قائم کرنا یا کسی شخصیت کی تنقیص کرنا جانبین میں سے کسی کا مقصود و منشا نہیں ہے، پھر یہ تبادلۂ افکار بالکل ذاتی حیثیت میں ہوا ہے۔

تنقیدات نمبر 1

-1 قولہ تعالیٰ بل رفعه الله اليه ...... الخ ۔ رفع کی حقیقت رفع حسی ہے۔ رفع درجات مجازی معنی ہے: وَاِذ يرفع ابراهيم القواعد من البيت، لا ترفعوا اصواتكم فوق صوت النبى، ورفعنا فوقهم الطور وغیرہا آیات میں رفع حسی ہی مراد ہے۔ زیر بحث آیت میں رفع سے حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی معنی لینا خلاف ظاہر ہے۔ یہودی کہتے تھے کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا، سولی پر چڑھا دیا۔ عیسائی کہتے تھے کہ وہ قتل ہونے کے بعد زندہ ہو کر آسمان پر اُٹھائے گئے۔ قرآن نے نے فرمایا کہ انہوں نے قتل نہ کیا بلکہ وہ آسمان پر اُٹھائے گئے۔ اس میں دونوں کی تردید ہوگئی۔ سوال یہ ہے کہ عیسائی کہتے تھے کہ رفعه الله، اللہ نے ان کی تردید میں فرمایا: بل رفعه الله یہ تردید ہوئی کہ تائید ہوئی؟ ایسا محتمل اور مبہم لفظ ارشاد فرمایا جس سے تردید کی بجائے عیسائیت کی تائید ہوئی اور اسی لفظ کی بنا پر امتِ مسلمہ کی غالب اکثریت نے اپنا عقیدہ یہی ٹھہرا لیا کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اُٹھائے گئے۔ اس کی ذمہ داری تو اللہ تعالیٰ پر آتی ہے، اللہ تعالیٰ کو چاہیے تھا کہ یوں ارشاد فرماتا مَا قتلوُهُ يقيناً وَمَا رفعهُ الله بل رفع درجاته۔

-2 قولہ تعالیٰ يعيسىٰ انّى متوفيك ورفعك اليّ ...... الخ متوفی کا مادہ وفا ہے، اسی سے ایفا اور استیفا ہے، توفی بھی استیفا کے معنی میں ہے۔ توفی کے معنی ہیں کسی چیز کو وصول کر لینا، لے لینا، واپس بلا لینا۔ غالباً قرآن مجید کے نزول سے پہلے پورے عربی لٹریچر میں توفی بمعنی موت نہیں ملے گا۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے قرآن نے توفی کا لفظ استعمال کیا۔ کیونکہ موت سے فنا کا تصور ہوتا ہے اور قرآن کی رو سے موت کے بعد روح فنا نہیں ہوتی، اس لیے قرآن نے موت کی جگہ توفی استعمال کیا اور توفی کی دو صورتیں ہیں۔ بدن کو چھوڑ دینا اور روح لے لینا یا

روح اور بدن سمیت اُٹھا لینا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: الله يتوفى الانفس حين موتها والتى لم تمت فى منامها۔ اس آیت میں موت[1] کو بھی توفی سے تعبیر کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ توفی موت میں منحصر نہیں ہے، لہٰذا یہ آیت آپ کی دلیل نہیں بلکہ ہماری دلیل ہے۔ متوفيك کے بعد وَرَافعك اليَّ فرما کر عطف تفسیری کے ذریعے توفی کی تشریح رفع سے کر دی ہے۔ اس کے ظاہراً معنی یہ ہیں کہ عیسیٰؑ کی توفی رفع آسمان کی شکل میں ہوئی۔

-3 قولہ چوتھا وعدہ تمہارے متبعین کو بنی اسرائیل کے منکرین پر غالب کرنے والا ہوں ...... الخ۔ غلبہ کی دو صورتیں ہیں۔ یہودی موجود رہیں اور مسلمان نصاریٰ ان پر غالب ہوں یا یہودی فنا ہو جائیں، قیامت تک غلبہ کی یہ دونوں صورتیں رہیں۔ نیز الىٰ يوم القيامه سے مراد قرب قیامت ہے ورنہ قیامت کا دن تو وہ ہوگا جب مُردوں کو اُٹھایا جائے گا، حساب کتاب لیا جائے گا۔ اس سے پہلے عرصۂ دراز تک فنا کا عالم رہے گا، اس وقت نہ یہودی ہوں گے نہ عیسائی ہوں گے، اور نہ غلبہ کی کوئی صورت ہوگی۔

-4 فلمّا توفيتنى كنتَ انتَ الرَّقيبَ عليهم ...... الخ ۔ اس کا جواب توفی کی بحث میں ہو چکا ہے۔

-5 وجعلنى مبرَكًا اَينَ مَاكنتُ ......الخ۔ جواباً عرض ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب دوبارہ تشریف لائیں گے تو نبوت کی حیثیت سے نہیں آئیں گے، اگرچہ نبی ہوں گے۔ اس وقت وہ شریعت اسلامیہ پر عمل کریں گے، ان پر کوئی نئی وحی نہیں آئے گی۔ لہٰذا ان کا آنا ختم نبوت کے منافی نہیں، کیونکہ خاتم النبيين یا انا آخر الانبياء یا ختم بى النبيون کا مطلب یہ ہے کہ میرے بعد کسی کو نئی نبوت نہیں دی جائے گی، اگر انبیائے سابقین میں سے کوئی آجائے تو وہ ختم نبوت کے منافی نہیں۔ یہاں پر

---

[1] لگتا ہے مصنف/کاتب سے سہواً موت لکھا گیا ہے درآں حالیکہ یہاں نیند ہونا چاہیے تھا۔

حضرت مولانا قاسم نانوتوی کی تحقیق سامنے رکھیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر بالفرض حضورؐ کے زمانے میں یا حضورؐ کے بعد کوئی نبی آجائے تو بھی ختم نبوت کے منافی نہیں، اس کی مثال یہ ہے کہ صوبہ سندھ کا گورنر اگر چند روز کے لیے صوبہ پنجاب میں آجائے تو اگرچہ وہ گورنری سے معزول نہیں ہوا لیکن پنجاب میں اس کی گورنری کے احکام نہیں چلیں گے۔

6- قولہ تعالیٰ ومبشراً برسولٍ یاتی من بعدی ...... الخ۔ یہاں من بعد موتی نہیں فرمایا بلکہ من بعدی فرمایا ہے۔ یہ بعد ایسا ہی ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام کا ارشاد ہے بئسما خلفتمونی من بعدی لہٰذا اس آیت سے استدلال نہیں ہوسکتا۔

7- قولہ: جب عیسیٰ دوبارہ زمین پر تشریف لائیں گے، اس وقت بل رفعه الله اليه ، کا کیا مطلب ہوگا، کیونکہ قرآن کہہ رہا کہ اللہ نے ان کو اُٹھالیا مگر وہ بنفسِ نفیس لوگوں کے درمیان موجود ہیں؟......الخ۔ جواباً عرض ہے کہ اس کا تعلق زمانہ ماضی سے ہے اور رفع فعل ماضی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زمانہ ماضی میں اللہ نے ان کو اُٹھایا تھا اور اب ان کی دوبارہ تشریف آوری سے اس رفع کی مزید تحقیق ہوگئی کہ واقعی اللہ نے ان کو اُٹھایا تھا، جب ہی تو یہ واپس آئے ہیں، تو ان کی دوبارہ واپسی سے رفع کا تحقق ہوا نہ کہ نفی۔ کیا آپ کے نزدیک فعل ماضی کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ اس کا تحقق زمانہ حال تک باقی رہے؟

8- آخری گزارش ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی کے بارے میں جو قوی ترین احادیث مروی ہیں، ان کو آپ اس لیے رَد کرتے ہیں کہ یہ احادیث قرآن کے خلاف ہیں۔ حالانکہ ان آیات سے رفع آسمانی کی تائید ہوتی ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ آیات (متوفیک، رافعک) دونوں معنی کو محتمل ہیں۔ اس صورت میں احادیث سے قرآن کی تفسیر ہوکر ایک معنی یعنی رفع آسمانی کا تحقق ہوگیا اور دوسرا احتمال یعنی رفع درجات باطل ہوگیا۔ نیز یہ بھی اصول ہے: اذا جاء الاحتمال بطل

الاستدلال ۔ ایسی صورت میں احادیث کو رَد کرنا، میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اپنی تائید میں آپ نے جن حضرات کے نام پیش فرمائے یعنی عبیداللہ سندھی، ابوالکلام آزاد، امین احسن اصلاحی وغیرہ، ان بے چاروں کی چودہ سوسالہ اُمت مسلمہ کے متفقہ عقیدے اور اساطینِ امت، ائمہ حدیث وتفسیر، فقہا ومشائخ، مؤلفین کتب عقائد، شیخ عبدالقادر جیلانی، مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، علامہ انور شاہ صاحب، حکیم اُمت تھانوی کے سامنے کیا حقیقت ہے۔ آپ کے پیش کردہ یہ حضرات تو ان لوگوں کی خاک پا کے برابر بھی نہیں۔ جبکہ سب کا متفقہ عقیدہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام بِجَسَدِہٖ آسمان پر اُٹھائے گئے۔

9- جن حضرات نے ''متوفیک'' کا مطلب 'ممیتک' لیا ہے جیسے کہ ابن عباسؓ سے مروی ہے، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ 'امات' نزولِ عیسیٰ کے بعد قربِ قیامت میں ہوگی۔

10- آپ کا یہ فرمانا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں کی دسترس سے بچا کر پھر انہیں اور ان کے متبعین کو گروہِ منکرین پر غالب فرما کر ان کی طبعی موت واقع ہوئی۔ آپ کی یہ بات تاریخ اور قرآن کے خلاف ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں یہودی غالب رہے، عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمان کے عرصہ بعد عیسائیوں کو یہود پر غلبہ ہوا، اور قرآن کہتا ہے: وجاعل الذين اتبعوك فوق الذين كفروا ۔ اس آیت میں متبعین کے غلبے کی بشارت ہے نہ کہ خود عیسیٰ علیہ السلام کے غلبہ کی۔

جواب تنقیدات نمبر 1

1- قولہ تعالیٰ ''انی متوفیک ورافعک الیّ...... الخ'' میں ''توفی'' اور ''رفع'' عطف کے ساتھ آئے ہیں اور عطف معنوی مغائرت کو چاہتا ہے تو یہاں ''متوفیک'' اور ''رافعک'' ہم معنی نہیں ہوسکتے۔ اگر ''توفی'' کے معنی بھی ''رفع حسی'' لیے جائیں تو ایک ہی مفہوم کے لیے دو مختلف الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لامحالہ یہاں ''توفی'' کے معنی موت کے ہی لیے جائیں گے اور جب یہاں

''توفی'' بمعنی موت مراد ہوگا تو کم از کم حضرت عیسیٰ کے ضمن میں دیگر مقامات ''فلمّا توفیتنی'' پر بھی یہی معنی متعین ہو جائیں گے کہ ''القرآن یفسر القرآن'' اور ''القرآن یفسر بعضه بعضا'' کے تحت اس لفظ کے مفہوم کی تعین ہوگئی۔ لفظ ''توفی'' موت میں منحصر نہ سہی مگر ''توفی'' بمعنی ''ترفع'' بھی قرآن میں کہیں استعمال نہیں ہوا۔

2- عیسائیت کے عقیدے کی تائید تو اسی صورت میں ہوتی ہے جب ''رفع'' سے مراد ''رفع حسی'' لیا جائے۔ رفع درجات کی صورت میں تائید بالکل نہیں ہوتی، بلکہ ہمارا اصل اعتراض ہی یہ ہے کہ ''رفع جسمانی'' کی مزعومہ شکل میں تو عیسائیت کے دعوے کی تائید ہوتی ہے جبکہ قرآن نے اس کو رد کر دیا ہے اور یہی وہ قرینہ قوی ہے جس کے تحت حقیقی معنی کے بجائے مجازی معنی پر اصرار کیا جارہا ہے۔

3- اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت عیسیٰؑ کی ''توفی'' رفع آسمانی کی شکل میں ہوئی جیسا کہ مولانا امین احسن اصلاحی نے بھی سمجھا ہے تو انہوں نے نتیجتاً یہ بھی مان لیا ہے کہ ''توفی'' کے بعد اب ان کا نزول نہیں ہوگا۔

4- حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اُمت کے بگاڑ کا وقت اپنی وفات کے بعد بتایا ہے۔ اگر ان کی موت قربِ قیامت کے وقت ہوگی تو اس وقت تو از روئے روایات تمام یہود و نصاریٰ ان پر ایمان لا چکے ہوں گے، تو اس وقت ان سب کے ایمان لانے کے بعد ان پر کفر و شرک کا اثبات کیسے کیا جائے گا؟ پھر بخاری شریف کی ایک حدیث کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان: ''فاقول کما قال العبد الصالح..... الخ'' صاف بتا رہا ہے کہ آپؐ کے نزدیک بھی حضرت عیسیٰؑ کی اُمت ان کی وفات کے بعد بگڑی تھی اور اسی طرح آپ کی اُمت بھی آپؐ کی وفات کے بعد بگڑے گی۔ تو حضرت عیسیٰؑ کی اُمت کے بگاڑ سے ثابت ہوگیا کہ آپ کی وفات واقع ہو چکی ہے۔

5- قربِ قیامت کے وقت نزولِ مسیحؑ کا ذکر قرآن میں تو اشارتاً بھی نہیں آیا۔ اس مضمون

کی بیشتر روایات، وہب بن منبہ اور کعب الاحبار وغیرہم سے منسوب ہیں جو اہل کتاب میں مسلمان ہوئے تھے، اور ایک روایت جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے تو وہ خبر واحد کے درجہ میں ہے، جس پر نہ تو کوئی عقیدہ قائم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی امور غیبیہ کے بارے میں کسی خبر واحد پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

6- سورۂ آل عمران کی آیت میں وفات، رفع، اور تطہیر کے جو وعدے کیے گئے ہیں، تو یہاں ''رافعک الی'' کے مابعد ''ومطهرك من الذين كفروا'' کا متصل فقرہ صاف بتا رہا ہے کہ اس مقام پر شرف واجتبا اور عظمت و تکریم کا ذکر مقصود ہے۔

7- سورۂ مریم کی آیت ''والسّلام علی ...... الخ'' میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے لیے بھی عام انسانی زندگی کے معروف مراحل پیدائش، موت اور بعثت ثانیہ ہی کا ذکر کیا ہے مگر اپنی زندگی کے سب سے مہتم بالشان مرحلے ''رفع الی السماء'' اور ''نزول من السماء'' کا اشارہ تک نہیں کیا، جس سے یہی سمجھا جائے گا کہ یہ مرحلہ فی الحقیقت پیش ہی نہیں آیا اور نہ آئندہ پیش آئے گا، تو آپ ایک انہونی بات کا ذکر کیسے فرما سکتے تھے؟

8- متذکرہ آیات قرآنی میں ''الی یوم القیمة'' کے الفاظ ہر جگہ قربِ قیامت کے زمانے کے بجائے (جو خاصا طویل ہوگا) وقوعِ قیامت سے ماقبل کے زمانے پر دلالت کر رہے ہیں۔ اس ''الی'' کو عین قیامت کے دن کے نصف النہار تک کھینچ کر لے جانا محض لفظی گرفت ہے ورنہ اس کے مفہوم کو ''واتموا الصیام الی الیل'' جیسی مثالوں کو سامنے رکھ کر بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ جس طرح یہاں ''الی الیل'' سے دن کا اختتام اور آغاز شب کے اوّلین لمحات مراد ہیں۔ اسی طرح ان آیات میں ''الی یوم القیمة'' سے زمانہ ماقبل قیامت کا اختتام اور وقوع قیامت کا اوّلین لمحہ متصور ہوگا۔ لہٰذا وقوع قیامت تک اہل ایمان و اہل کفر میں غالب و مغلوب اور اہل کتاب کے مابین بغض و عداوت کی صورت علیٰ حالہ برقرار رہنی چاہیے۔ یعنی جب تک روئے زمین پر کوئی متنفس موجود رہے، یہ صورتِ حال برقرار رہے گی کہ ''الی یوم

القیمة'' کی صراحت اسی اَمر کی متقاضی ہے مگر از روئے روایات یہ صورت قیامت سے بہت پہلے ختم ہو چکی ہوگی۔ تو کیا اس تعارض کو قرآن کی تصریحات کا انکار کر کے دُور کیا جائے گا؟

9- حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ارشاد ''بئسما خلفتمونی من بعدی'' اور حضرت عیسیٰؑ کے ''یأتی من بعدی'' کا فرق بیان ماضی اور ذکر مستقبل سے ظاہر ہے اور یہ بھی کہ موسیٰ علیہ السلام ایک مقررہ مدت کے لیے کوہِ طور پر تشریف لے گئے تھے تو انہوں نے قوم میں اپنی غیر موجودگی کے زمانے کو ''من بعدی'' سے تعبیر کیا۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی کوہِ طور سے واپس آ کر یہ بات نہیں کہہ رہے ہیں نہ آسمان سے آنے کے بعد کہہ رہیں بلکہ ''من بعدی'' سے وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول ''فاقول کما قال العبد الصالح'' کے مطابق اپنی وفات ہی مراد لے رہے ہیں، لہٰذا آپ کا یہ استدلال درست نہیں ہے۔

10- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قرآن کے نقل کردہ قول: وجعلنی نبیا وجعلنی مبارکًا این ما کنت. کہ ''میں جہاں کہیں بھی ہوں اللہ نے مجھے نبی اور بابرکت بنایا ہے'' کی موجودگی میں چند متذکرہ روایات کے تحت یہ کہنا کہ وہ جب دوبارہ تشریف لائیں گے تو آنخضورؐ کے ایک عام اُمتی کی حیثیت سے غلبۂ اسلام کے لیے کام کریں گے اور پھر ان کی ان دونوں حیثیتوں (نبی و اُمتی) کا اثبات دو مختلف صوبوں کے گورنروں کی مثال سے کرنا کوئی معقول طرزِ استدلال نہیں ہے کیونکہ ایک شخص یا تو ''نبی'' ہو سکتا ہے یا ''اُمتی'' لیکن بیک وقت ''نبی'' اور ''اُمتی'' نہیں ہو سکتا اور پھر جب ''این ما کنت'' (میں جہاں کہیں بھی ہوں) کی صراحت موجود ہو تو وہ جہاں بھی ہوں گے، نبی ہوں گے۔

11- میں نے تائید میں جن حضرات کے نام تحریر کیے تھے تو اس سے مقصد صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ یہ نقطۂ نظر تفردات میں سے نہیں ہے ورنہ میں تو خود شخصیات کی بجائے نظریات کی معقولیت پر یقین رکھتا ہوں۔

تنقیدات نمبر 2

1- قولہ عطف مغائرت کو چاہتا ہے......الخ۔ عطف ہر جگہ مغائرت کے لیے نہیں ہوتا بلکہ کبھی تفسیر و تشریح، کبھی تاکید کے لیے بھی ہوتا ہے مثلاً ''قد جاء کم من اللہ نورٌ و کتٰبٌ مبین'' یہاں نور اور کتاب ایک ہی ہیں۔ مغائرت نہیں ہے اور دیکھیے ''نخلع و نترک من یفجرک'' خلع و ترک میں مغائرت نہیں۔ اس کی بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں۔

2- آپ نے میری گزشتہ گزارشات بالخصوص نمبر 1 پر غور نہیں فرمایا۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے رفعه الله۔ اللہ تعالیٰ بھی فرماتا ہے رفعه الله۔ یہ تردید ہوئی یا تائید۔ تردید جب ہوتی جب فرماتے وما رفعه الله بل رفع درجاتهٗ۔ رفع کے حقیقی معنی چھوڑ کر مجاز مراد لینا خلافِ ظاہر ہے۔ مجاز کے لیے قرینہ کی ضرورت ہوتی ہے، حقیقت کے لیے کسی قرینہ کی ضرورت نہیں اور رفع کی تفسیر احادیث صحیحہ قویہ اور اجماعِ اُمت سے ہوگی۔ لہٰذا متوفیک کے معنی بھی متعین ہو گئے کہ اس سے مراد موت نہیں ہو سکتی۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے موت کے بعد رفع۔ قرآن کہتا ہے: ما قتلوہ وما صلبوہ وما قتلوہ یقینا بل رفعه الله الیه۔ یعنی موت نہیں ہوئی وہ بجسدہ الشریف اُٹھائے گئے، لہٰذا عیسائیوں اور یہودیوں دونوں کی تردید ہو گئی۔

3- قولہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اُمت کا بگاڑ اپنی موت کے بعد بتایا ہے......الخ۔ مجھے کوئی ایسی آیت معلوم نہیں۔ وہ آیت پیش فرمائیں۔ ہاں توفّی کے بعد ہو سکتا ہے اور توفّی سے مراد موت نہیں۔

4- قولہ خبر واحد سے عقیدہ ثابت نہیں ہوتا......الخ۔ جب اخبار صحیحہ قویہ کثیرہ ہوں اور اس کے ساتھ اجماع اُمت بھی، پھر بھی عقیدہ ثابت نہ ہوگا۔

5- سورۂ آلِ عمران میں وفات، رفع، تطہیر......الخ۔ تطہیر کی سب سے اعلیٰ صورت یہ ہے

کہ ان کو زندہ آسمان پر اُٹھالیا۔

6- سورۂ مریم کی آیت و السلام علیّ......الخ۔ عدم ذکر سے عدم وقوع لازم نہیں۔ نیز یوم ابعث حیّا سے رفع آسمانی مراد ہوسکتا ہے۔ کیونکہ یوم ولدت و یوم اموت و یوم ابعث حیّا میں عطف واو کے ساتھ ہے۔ واو ترتیب کے لیے نہیں مطلقاً جمع کے لیے ہے اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ بعث یوم القیامہ کے تو سب قائل ہیں۔ اس کے ذکر کی خاص ضرورت نہ تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ کوئی مخصوص بعث ہے۔

7- اس الّسی کو عین قیامت کے دن نصف النہار......الخ۔ غلبہ کی سب سے اعلیٰ شکل یہ ہے کہ یہودی بالکل ہی ناپید ہوجائیں اور متبعین عیسیٰ مسلمان ہوں گے۔

8- قولہ حضرت موسیٰ کا ارشاد بئسما خلفتمونی من بعدی ...... الخ۔ جس طرح موسیٰ کا کوہِ طور پر تشریف لے جانا عارضی تھا، اس لیے عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر جانا بھی عارضی ہے، الہٰذا دونوں میں کچھ فرق نہیں۔

9- قولہ ایک شخص بیک وقت نبی اور اُمتی نہیں ہوسکتا......الخ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے بے شمار نبی آئے، وہ نبی بھی تھے اور موسیٰ علیہ السلام کے اُمتی بھی۔ کیونکہ وہ سب شریعتِ موسیٰ کے پیرو تھے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی شریعتِ اسلامی کے پیرو ہوں گے، ان پر نئی وحی نہیں آئے گی۔

10- قولہ میں نے اپنی تائید میں جو نام......الخ۔ جیسے آپ کا تفرد ہے ایسے ہی ان سب حضرات کا تفرد ہے۔ شخصیت سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن اجماعِ اُمت سے؟

11- احادیث صحیحہ تو یہ کثیرہ، اجماعِ اُمت اور سلف صالحین کی غالب اکثریت کے دفاع میں ہی سلامتی ہے جبکہ ان کا مسلک ظاہر قرآن کے مطابق ہے۔ فقط واللّٰہ تعالیٰ اعلم و علمہ اتم و احکم فی کل باب والسلام علیکم و علی من لدیکم۔

جواب تنقیدات نمبر 2

1- عطف بالعموم مغائرت ہی کو چاہتا ہے اور جہاں کہیں بظاہر تفسیر و تعبیر یا تاکید متبادر ہوتی

ہے تو وہاں بھی از روئے لغت کسی نہ کسی درجے میں معنوی فرق موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ خود آپ نے جو دو مثالیں تحریر کی ہیں ان میں بھی یہ فرق واضح شکل میں موجود ہے۔ قرآن کے حروف والفاظ اور آیات وسور کے مجموعے کو ''کتاب'' اور اس کے مطالب ومعانی اور مضامین موعظت وحکمت یعنی اس کی معنوی حیثیت کو ''نور'' کہا گیا ہے۔ قرآن کے اور بھی بہت سے نام ہیں مثلاً ہدایت، برہان، فرقان، ذکر، موعظت وغیرہ اور ان سب سے مراد قرآن ہی لیا گیا ہے تو کیا یہ تمام الفاظ اپنے معنوی فرق کے باوجود ہم معنی قرار دے دیے جائیں گے؟ اسی طرح خلع اور ترک کے الفاظ میں بھی معنوی فرق موجود ہے۔ خلع کے معنی اُتار دینا یا اُتار پھینکنا اور ترک کے معنی چھوڑ دینے کے ہیں۔ ''فاخلع نعلیک فانک بالواد المقدس طوی'' آپ انہیں زیادہ سے زیادہ قریب المفہوم کہہ سکتے ہیں، ہم معنی قرار نہیں دے سکتے۔

2- آپ کو شکایت ہے کہ میں نے آپ کی بات نہیں سمجھی اور یہی شکایت مجھے آپ سے ہے کہ آپ نے میری معروضات پر غور نہیں فرمایا۔ قرآن سے عیسائیت کے دعوے کی تائید تو جبھی ہوگی جب رفع سے مراد ''رفع جسمانی'' لیا جائے، مگر جو لوگ رفع سے رفع درجات مراد لیتے ہیں، ان پر یہ اعتراض کیسے کیا جاسکتا ہے کہ ''عیسائی بھی کہہ رہے ہیں رفعه اللّٰہ اور قرآن بھی کہہ رہا ہے بل رفعه اللّٰہ تو یہ تردید ہوئی یا تائید؟''

3- عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کا بگاڑ ''مادمت فیھم'' اور ''فلمّا توفیتنی'' کے بعد ہوا اور یہی آیت حضرت عیسیٰؑ کی موت کو قطعیت کے ساتھ ثابت کررہی ہے کیونکہ اس میں عیسائیوں کے عقائد بگڑنے کا زمانہ حضرت مسیحؑ کی وفات کے بعد بیان کیا گیا ہے اور چونکہ وہ نزولِ قرآن سے پہلے بگڑ چکا ہے اس لیے حضرت عیسیٰؑ کی وفات بھی نزولِ قرآن سے پہلے ہوچکی تھی۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ ''میں وہی بات کہوں گا جو عبد صالح (عیسیٰؑ) نے کہی کہ میں ان پر گواہ تھا، جب تک ان میں رہا پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو تو ہی ان پر نگران تھا'' لیکن اگر ان کی وفات قربِ قیامت کے وقت تسلیم کی جائے تو از روئے روایات تمام یہود و نصاریٰ ایمان

لا چکے ہوں گے تو اندریں صورت حق تعالیٰ کے نگران اور ان کے حالات سے حضرت عیسیٰؑ کے بری الذمہ ہونے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ تو ثابت ہوا کہ قوم کا یہ بگاڑ ''**مادمت فیھم**'' اور ''**فلمّا توفیتنی**'' کے بعد ہوا ہے اور یہ مرحلہ آنحضرتؐ کے متذکرہ قول سے پیشتر گزر چکا ہے۔

4- میں نے خبر واحد کا ذکر نزول مسیحؑ کے بارے میں کیا تھا مگر آپ نے جن اخبار صحیحہ قویہ کثیرہ کا ذکر فرمایا ہے، یہ نزول مسیحؑ کے بارے میں ہرگز نہیں ہیں۔

5- اگر تطہیر کی سب سے اعلیٰ وارفع صورت ''رفع الی السماء'' ہی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کفارِ مکہ، یہود ہی کی طرح آپؐ کے قتل کا فیصلہ کر چکے تھے، اس سے کیوں محروم رکھا گیا؟ بلکہ آپ کے لیے تو یہ تک نہ کیا گیا کہ شہپر جبرئیلؑ یا کسی تخت سلیمانی پر بٹھا کر بحفاظت مدینہ پہنچایا جاتا بلکہ آپؐ کے حق میں عام انسانی تدابیر ہی کے ذریعہ کفار کی تدابیر کا مقابلہ کیا گیا مگر حق تعالیٰ نے یہاں بھی ''**واذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک او یقتلوک او یخرجوک ویمکرون ویمکر اللہ واللہ خیر الماکرین**'' اللہ کی اس تدبیر کو جو عام عادت سے خارج نہ تھی بلکہ انسانی تدابیر ہی کے انداز پر نافذ العمل ہوئی تھی، بہترین تدبیر کہا ہے، پھر کیا عیسیٰ علیہ السلام کے لیے اللہ کی زمین اتنی تنگ ہوگئی تھی کہ انہیں یہود کی دسترس سے بچانے کے لیے دنیا میں کوئی جائے پناہ یا گوشۂ عافیت باقی نہ رہا تھا؟

6- کسی حقیقت مدرکہ کے مشہور ومعلوم مفہوم کے ہوتے ہوئے کسی مجہول وغیر معروف مفہوم کا اثبات طرفہ طرزِ استدلال ہے۔ اگر ''**بعث یوم القیمة**'' کے سب قائل ہیں تو کیا ولادت اور موت کے دن کے سب قائل نہیں ہیں؟ تو ان کا ذکر بھی غیر ضروری ہونا چاہیے۔

7- اگر غلبہ کی اعلیٰ صورت یہی تھی کہ یہود بالکل نابود ہو جائیں تو تمام اہل کتاب کے مابین بغض وعداوت کو قیامت تک کس طرح پہنچائیں گے کہ یہاں بھی ''**الی یوم القیمة**'' کا فقرہ موجود ہے؟

8- حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور سے واپس آ کر کہا تھا ''**بئسما خلفتمونی من بعدی**''، مگر عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے واپس آ کر ''**یأتی من بعدی**'' نہیں کہہ رہے ہیں، دونوں کا فرق ظاہر ہے۔

9- اگر دونوں ہی صاحبِ کتاب وصاحبِ شریعت نبی ہوں تو ایک دوسرے کا اُمتی نہیں ہوسکتا۔ حسنِ اتفاق سے یہاں یہی صورت درپیش ہے۔ نیز حضرت عیسیٰ کے قول ''**این ما کنت**'' کی صراحت ہر جگہ ان کی نبوت کے اثبات پر دلیل قطعی ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں گے نبی ہوں گے!

10- اخبار وآثار، تعامل امت اور اجماع وغیرہ قرآن کے مقابلے میں دوسرے اور تیسرے درجے کے ماخذ ہیں۔ جب کوئی بات نصوص قرآنی سے بالصراحت ثابت ہو رہی ہو تو قرآن ہی کو ترجیح دی جائے گی۔

تنقیدات نمبر 3

1- قولہ عطف بالعموم مغائرت ہی کو چاہتا ہے...... الخ۔ عطف تفسیری میں اگرچہ معطوف ومعطوف علیہ میں لغۃً فرق ہوتا ہے، لیکن معطوف ومعطوف علیہ کا مصداق ایک ہی ہوتا ہے جیسے نور وکتاب دونوں کا مصداق قرآن مجید ہی ہے۔ اسی طرح توفی اور رفع میں لغۃً فرق ہے، عموم وخصوص کی نسبت ہے، توفی عام ہے اور رفع خاص ہے، لیکن دونوں کا مصداق ایک ہے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ اُٹھایا جانا۔

2- قولہ آپ کو شکایت ہے...... الخ۔ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت پھر رفع کے قائل تھے۔ اللہ نے موت کی تردید اور رفع کی تائید کی، فرمایا: **وما قتلوہ وما صلبوہ ...... وما قتلوہ یقینا بل رفعہ اللہ الیہ**۔ موت کی تردید کرتے ہوئے کلام میں زور پیدا کرنے کے لیے یقیناً فرمایا اور رفع میں تردید مقصود نہ تھی بلکہ تائید مقصود تھی، اس لیے اس کے بعد یقیناً نہیں فرمایا۔ اگر دونوں باتوں میں تردید مقصود ہوتی تو دونوں کے بعد یقیناً کا اضافہ ہوتا۔ عاقلے را اشارہ کافی است۔ اگر رفع درجات مراد ہوتا تو درجات کے ذکر سے کیا چیز مانع تھی، صاف فرماتے **ما رفعہ اللہ بل رفع**

درجاتہ ۔ایک طرف یہودی ہیں جو قتل پر مُصر ہیں، دوسری طرف عیسائی جو رفع پر اصرار کر رہے ہیں۔آپ کے خیال میں اللہ تعالیٰ دونوں کی تردید فرماتے ہیں: وما قتلوہ وما صلبوہ ...... وما قتلوہ یقینا بل رفعہ اللہ الیہ اور درجات کو ذکر نہیں کرتے مگر درجات مراد ہیں۔گویا المعنی فی بطن الشاعر۔معاذ اللہ،اللہ تعالیٰ کو اتنی سی بات بھی کہنی نہیں آئی کہ ''ان کی موت واقع ہوئی نہ وہ آسمان پر اُٹھائے گئے'' بلکہ جو بات عیسائی کہتے تھے وہی فرمادی کہ بل رفعہ اللہ الیہ۔پھر حقیقت و مجاز کا جھگڑا کھڑا ہوگیا۔کیا بنیادی عقائد کے بیان میں ایسی مجمل اور مبہم بات کہی جاتی ہے؟

3- قولہ ''عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کا بگاڑ مادمت فیھم اور فلما توفیتنی کے بعد ہوا'' یہ بات صحیح ہے،لیکن یہ کیسے لازم آیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی موت بھی نزولِ قرآن سے پہلے ہوئی؟ البتہ توفی ہوئی،لیکن توفی کو موت لازم نہیں۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کما قال العبد الصالح سے بھی موت لازم نہیں آتی۔کما لا یخفی،توفی موت میں منحصر نہیں۔اس کے ثبوت کے لیے ایک آیت پہلے لکھ چکا ہوں۔ایک اور دیکھیے، سورۂ انعام کی آیت 60،61: وھو الذی یتوفکم بالیل ...... حتی اذا جاء تہ الموت توفتہ رسلنا......معلوم ہوا توفی اور موت میں عموم وخصوص کی نسبت ہے۔

4- مشکوٰۃ باب اشراط الساعۃ اور العلامات بین یدی الساعۃ اور باب نزول عیسیٰ علیہ السلام مطالعہ فرمائیں،آپ کو احادیث کثیرہ صحیحہ مل جائیں گی۔

5- قولہ اگر تطہیر کی سب سے اعلیٰ......الخ۔کیا یہ ضروری ہے کہ مفضول کو جو انعامات دیے جائیں وہ سب انعامات افضل کو بھی دیے جائیں؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا کا معجزہ دیا گیا جس سے ہزاروں جادوگر مسلمان ہوگئے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معجزہ کیوں نہ دیا گیا؟ عیسیٰ علیہ السلام کو معجزہ دیا گیا ابرئ الاکمہ والابرص واحی الموتی ،یہ معجزات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں نہ دیے گئے۔قولہ کیا عیسیٰ علیہ السلام کے لیے زمین تنگ ہوگی تھی......الخ۔عیسیٰ علیہ السلام کو قربِ قیامت

میں واپس لانا مقصود تھا،اس لیے ان کو اُٹھایا گیا نہ اس لیے کہ زمین تنگ ہوگئی تھی۔

6- کسی حقیقت مدرکہ کے مشہور......الخ۔عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور موت دونوں عام انسانوں کی ولادت اور موت سے ممتاز تھیں۔ولادت تو ظاہر ہے اور موت بھی، اس لیے کہ نزول کے بعد اور ہزاروں سال کی طول زندگی پانے کے بعد ہوگی۔

7- اگر غلبہ کی اعلیٰ صورت......الخ۔یونس علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: لولا انہ کان من المسبحین للبث فی بطنہ الی یوم یبعثون ۔ اگر وہ تسبیح نہ کرتے تو مچھلی کے پیٹ میں قیامت تک رہتے،حالانکہ اگر ان کی موت ہوجاتی تو وہ مچھلی میں ہضم ہوجاتے، پھر مچھلی بھی مر کے فنا ہوجاتی، جبکہ قیامت میں ہزاروں سال باقی ہیں۔تو لبث فی بطنہ الی یوم القیمۃ کس طرح ہوتا۔ فما ھو جوابکم فھو جوابنا۔

8- ''بعدی'' اگر ماضی کے لیے ہو تو اس کے معنی اور ہیں، مستقبل کے لیے ہو تو کچھ اور، یہ فرق آپ لغت سے دکھا سکتے ہیں؟

9- اگر دونوں صاحبِ کتاب وصاحبِ شریعت ہوں تو ایک دوسرے کا اُمتی نہیں ہوسکتا؟ اس کی دلیل کیا ہے؟ پہلے آپ نے فرمایا تھا کہ کوئی نبی اُمتی نہیں ہوسکتا۔اب فرماتے ہیں کہ صاحبِ کتاب اور صاحبِ شریعت نبی اُمتی نہیں ہوسکتا۔دونوں ہی دعوے بلا دلیل ہیں۔داؤد علیہ السلام صاحبِ کتاب بھی تھے اور موسیٰ علیہ السلام کے متبع بھی تھے کیونکہ شریعت موسوی ہی تھی۔عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت بھی موسوی تھی، صرف چند احکام میں فرق تھا۔ این ما کنت کا جواب دیا جاچکا ہے۔تکرار میں تضییع وقت ہے۔

10- اخبار، آثار، اجماعِ قرآن کے مقابلہ میں......الخ۔احادیث قرآن کی تفسیر وتشریح ہیں: ویعلمکم الکتٰب والحکمۃ ۔اگر قرآن میں اجمال وابہام ہو تو حدیث ہی فیصلہ کُن ہے۔نیز اجماعِ اُمت سے معلوم ہوا کہ پوری اُمت نے قرآن کا کیا مطلب سمجھا۔ اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ ۔ والسلام مع الاکرام

جوابِ تنقیدات نمبر 3:

1- ''توفی'' اور ''رفع'' کے مصداق تو بہر صورت حضرت عیسیٰؑ ہی ہیں کہ ''توفی'' بھی انہی کی ہوئی ہے اور ''رفع درجات'' کا ذکر بھی انہی کے حق میں ہے مگر کسی مصداق کی وحدت اس کے احوال وصفات کے فرق کو ختم نہیں کر دیتی اور یہاں احوال ہی کا فرق پیش نظر ہے جس سے اصل مدعا ثابت ہوتا ہے۔

2- حق تعالیٰ نے اس مقام پر عیسائیوں کے کسی دعوے کا ذکر نہیں کیا جس کی تائید یا تردید ثابت کی جائے، مذکورہ آیت میں صرف یہود کے قتل وصلب کی تردید کی ہے۔ اس کے بعد رفع درجات کا ذکر ہے اور وہ اس لیے کہ یہود ان کو ذلت کی موت دینے کے درپے تھے، بنابریں یہ ذکر ضروری تھا۔

3- ''توفی'' اگر موت میں منحصر نہیں تو اس سے رفع الی السماء کا اثبات بھی کہیں ثابت نہیں۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد جسے بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔ اس میں ''فاقول کما قال'' کے فقرات (جو نزولِ قرآن کے عہد ہی میں کہے گئے ہیں ثابت کرتے ہیں) کہ حضرت عیسیٰؑ اپنی وفات کے بعد بارگاہِ الٰہی میں اپنی یہ معروضات پیش فرما چکے ہیں۔ جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بروزِ قیامت پیش فرمائیں گے تو ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک بھی حضرت عیسیٰؑ کی وفات ہو چکی تھی، ورنہ وہ ''فاقول کما قال'' کے بجائے ''فاقول کما یقول عبد الصالح'' کا فقرہ استعمال فرماتے۔

4- جن روایات میں دجال کے بعد نزول مسیحؑ کا ذکر ہے، وہ اپنے الفاظ ومعانی میں اس قدر مضطرب ومختلف ہیں کہ ان میں تطبیق ممکن نہیں۔ اس کی تصدیق خود علمائے محدثین نے کی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان روایات کو مؤطا امام مالکؒ، بخاری اور مسلم جیسی معتبر کتب احادیث میں جگہ نہ مل سکی اور یہ روایات زیادہ تر وہب بن منبہ اور کعب الاحبار

وغیرہم سے مروی ہیں جو اہل کتاب سے مسلمان ہوئے تھے اور کعب الاحبار کی شخصیت تو فاروقِ اعظمؓ کی شہادت کے واقعے میں بھی مشتبہ بیان کی جاتی ہے۔

5- عادت اللہ وہی ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ کے سلسلہ میں عمل کیا گیا اور اس تدبیر کو ہی اللہ کی غالب تدبیر فرمایا گیا، انسانی تدابیر کے مقابلے میں اللہ کی کسی تدبیر کو غالب قرار دینا اسی صورت میں بامعنی ہوگا، جب وہ تدبیر عام عادت سے خارج نہ ہو بلکہ انسانی تدابیر کے انداز ہی پر کی گئی ہو ورنہ حق تعالیٰ کی تکوینی تدابیر کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟

6- ''نزول کے بعد اور ہزاروں سال کی طویل زندگی پانے کے بعد موت ہوگی'' یہ محض ایک مفروضہ ہے جو عادت اللہ اور فطرت اللہ کے خلاف ہونے کے علاوہ قرآنی تصریحات کے بھی منافی ہے۔

7- یقیناً نہ وہ قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں ہضم ہوتے، نہ مچھلی مر کر فنا ہوتی کیونکہ جس شرط کے ساتھ حق تعالیٰ نے یہ بات فرمائی ہے وہ ضرور پوری ہو کر رہتی کہ اللہ کے لیے ان میں سے کوئی بات بھی مشکل نہ تھی مگر یہ بات ایک مشروط مفروضے کے طور پر بیان کی گئی ہے، وقوع کے طور پر نہیں کی گئی اور نہ ہی اس کا ذکر ''تعلیق بالمحال'' کے طور پر کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس کا وقوع محال تصور کر لیا جائے۔ اگر یقین نہ ہو، سرزمین مصر میں جا کر فرعون کے جسد ملعون کو دیکھ لیں جو کسی کیمیائی عمل کے بغیر دیکھنے والوں کے لیے نمونۂ عبرت بنا ہوا ہے۔ تو جو اللہ کسی مُردہ جسم کو ہزار ہا ہزار سال تک محفوظ رکھ سکتا ہے، وہ زندہ اجسام کو تا قیامت باقی رکھنے پر کیوں قادر نہ ہوگا؟ ہم تو مچھلی کے پیٹ میں حضرت یونس علیہ السلام کے تا قیامت امکان بقا کے بھی قائل ہیں اور یہود و نصاریٰ کے وجود نامسعود کو بھی تا قیامت تسلیم کرتے ہیں، یہ ذمہ داری تو آپ کی ہے کہ آپ ثابت فرمائیں کہ بقول آپ کے جب یہود و نصاریٰ قیامت سے پہلے نابود ہو جائیں گے، تو قرآن کے ''الی یوم القیمۃ'' کے حکم کا اطلاق ان پر کیسے ثابت ہوگا؟ هذا جوابنا فما هو جوابكم؟

8- یہ فرق بھی لغت سے آپ دکھائیں کیونکہ میں تو شروع سے یہ کہہ رہا ہوں کہ ''لا نبی بعدی'' میں لفظ ''بعدی'' کا جو مطلب ہے وہی مطلب ''یأتی من بعدی'' میں بھی ہونا چاہیے۔ ان دونوں فقروں کا فرق، نہ کہ لفظ ''بعدی'' کا فرق بھی آپ کی اس بات کے جواب میں تحریر کیا گیا تھا کہ ''جس طرح موسیٰ علیہ السلام کا کوہِ طور پر جانا عارضی تھا، اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر جانا عارضی ہے، لہٰذا دونوں میں کوئی فرق نہیں۔'' تو میں نے دونوں حالتوں میں جو فرق تھا وہ ظاہر کر دیا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ نے یہ بات آسمان سے واپس آ کر نہیں فرمائی جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور سے واپس آ کر فرمائی تھی۔ مگر آپ ہیں کہ لفظ ''بعدی'' کے ماضی اور مستقبل میں استعمال پر لغت سے فرق دریافت کر رہے ہیں؟ مولانا اس طرح تو الفاظ سے نہ کھیلیے!

9- تبع ہونا امتی ہونے کو مستلزم نہیں۔ حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی انبیا سابقین کے اتباع وتقلید کا حکم دیا ہے (اور یہ قرآن سے ثابت ہے[1]) تو کیا آپؐ ان تمام انبیا علیہم السلام کے اُمتی بھی بن گئے۔ چونکہ دونوں ہی صاحبِ کتاب وصاحبِ شریعت نبی تھے اور میرے خیال میں آپ کے سامنے اس وضاحت کی ضرورت نہ تھی، اس لیے یہ وضاحت نہیں کی گئی تھی پھر آپ کی لفظی گرفت کے بعد کر دی گئی۔

10- آپ کے نزدیک قرآن کے بیان میں اجمال وابہام ہوگا، میری نظر میں ایسا کوئی ابہام نہیں ہے۔ آپ نے استدراک میں جس روایت کے حوالہ سے چوتھی قبر کی بات کی ہے تو یہ روایت بھی اخبار احاد سے ہے، جس پر کوئی عقیدہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ انبیا علیہم السلام کے لیے ضروری ہے کہ جس جگہ ان کی وفات ہو اسی جگہ دفن کیے جائیں تو کیا عیسیٰ علیہ السلام اپنی وفات (بعد نزول) کے وقت پہلے سے چوتھی جگہ آ کر لیٹ جائیں گے اور ان کی روح اسی جگہ قبض ہوگی؟ جبکہ خود یہ بات بھی خلاف مشاہدہ ہے

۱ الانعام: آیت ۹۰

کہ اس احاطہ میں کسی چوتھی قبر کی جگہ خالی ہے، اگر کوئی جگہ باقی ہوتی تو حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں اپنے اس حق سے کیوں دست بردار ہوتیں؟

11- اب چونکہ نفس مضمون اور دلائل سے ہٹ کر نوبت لفظی گرفت اور الزام تراشی تک پہنچ گئی ہے جو میرا مقصود نظر ہرگز نہیں ہے اور جانبین کی طرف سے اپنے اپنے نقطۂ نظر کی مکمل وضاحت بھی ہو چکی ہے۔ لہٰذا کہی ہوئی باتوں کو بار بار دہراتے رہنے اور پیش کردہ دلائل کے اعادہ وتکرار سے تضییع اوقات کے علاوہ کچھ حاصل نہیں تو آیئے ہم دونوں ایک دوسرے کے حق میں دعائے خیر پر اس بحث کو ختم کر دیں، جو نتیجہ خیز ہونے کے بجائے ناخوش گوار بنتی جا رہی ہے۔

آخر یہ حضرات اظہارِ حق اور اعترافِ حقیقت کی دولت سے کیوں محروم ہیں؟

راولپنڈی کے دورانِ قیام میں جب اصل کتاب کا حصہ اوّل (جو طبع ہو چکا ہے) مکمل ہوا تو برادرم محمد امتیاز صاحب نے جو اِن اوراق کے مرتب ہونے میں ہمارے محرکِ اوّل بنے تھے، اس خوشی کے موقع پر میرے علاوہ اپنے چند احباب کو مدعو کیا اور بطورِ خاص شیخ التفسیر مولانا غلام اللہؒ کے خاص تلامذہ میں سے ایک برگزیدہ شخصیت کو موضوع زیرِ نظر پر تبادلۂ خیالات کی دعوت دی۔ ہم سب مدعوئین بعد مغرب جمع ہو گئے۔ میں نے مضمون کا اصل مسودہ بغرضِ مطالعہ مولانا کی خدمت میں پیش کیا کہ پہلے بغور مطالعہ فرمالیں، اس کے بعد موضوع پر گفتگو ہوگی۔ مولانا نے ڈیڑھ گھنٹہ تک اوراق کا مطالعہ فرمایا، متعدد مقامات کو بار بار پڑھا اور بالآخر جب کھانے کے لیے دسترخوان پر بیٹھے تو مکمل انشراحِ قلب کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ حق بات وہی ہے جو اس مضمون میں لکھی گئی ہے۔ اللہ انہیں اس حق گوئی اور اعترافِ حقیقت پر اپنی بے شمار نوازشات سے سرفراز فرمائے۔ (آمین)

برادرم محمد امتیاز صاحب جو چند سال پیشتر تک ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے حلقۂ درس کے حاضر باشوں میں سب سے آگے آگے ہوا کرتے تھے، اوائل جنوری 1994ء میں بمقام راولپنڈی جب ڈاکٹر صاحب کسی جلسہ گاہ میں درس کے لیے تشریف لائے تو انہوں نے اپنے ایک دوست کے ذریعے یہ مطبوعہ مضمون جلسہ میں یہ کہہ کر ان کی خدمت میں پیش کیا کہ حضرت آپ آج کل نزولِ مسیح اور ظہورِ مہدی کے موضوعات پر ہی تمام زورِ خطابت صرف فرما رہے ہیں اور اپنی شگفتہ تحریروں میں بھی انہی موضوعات کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، کسی اوّلین فرصت میں مضمون میں پیش کردہ دلائل پر اظہارِ خیال فرمائیں۔ مگر وہ دن آج کا ہے

واں ایک خامشی مرے سب کے جواب میں

ڈاکٹر صاحب موصوف کے بارے میں یہ بتانا یہاں ناموزوں نہ ہوگا کہ جب اس ناچیز کی کتاب ''بریلی سے بالاکوٹ'' چھپ کر منظرِ عام پر آئی تو موصوف نے لاہور شہر کے متعدد خطابات میں کتاب کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ میں ہر چند مؤلف کتاب سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں لیکن میری رائے میں سید احمد شہید کی تحریک کے خطوط پر منظم کرنے کے لیے اس سے بہتر، جامع اور مختصر کتاب میری نظر سے نہیں گزری، لہٰذا ہر مسلمان کو کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے اور ہر مسلمان کے گھر میں یہ کتاب موجود ہونی چاہیے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ کسی ایسے مزعومہ عقائد کے بارے میں جو خود ساختہ ہونے کے باوجود مسلم معاشرہ میں کسی نہ کسی طرح راہ پا چکے ہیں اور انہیں بطور مسلّمہ عقیدہ تسلیم کر لیا گیا ہو، ان کے خلاف لب کشائی کرنا یا اختلاف رائے کا اظہار بڑے حوصلہ اور جرأت کا کام ہے۔ بالعموم حضرات علما کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہی درپیش ہوتا ہے کہ کسی نقطۂ نظر کو حق وصداقت پر تسلیم کر لینے کے باوجود وہ اس کا علی الاعلان اعتراف نہیں کر سکتے۔ اور اکثر وبیشتر یہی وہ موانع ہیں جو تمام ایسے اشخاص کو جن کا تعلق کسی دینی درس گاہ، کسی مسندِ افتا اور کسی علمی یا قومی ادارے سے ہوتا ہے، پھر اگر عام عقائد کے خلاف وہ کوئی جرأت مندانہ قدم اُٹھاتے ہیں تو ان اداروں سے ان کی وابستگی برقرار نہیں رہ سکتی۔ حق گوئی و بے باکی کی یہ جرأت صرف ان ہی افراد و اشخاص میں ہوسکتی ہے جو ان علائق سے بے نیاز ہوں یا کنارہ کشی اختیار کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

برادرِ بزرگ مولانا عمر احمد عثمانی نے بھی برصغیر کی عظیم درس گاہوں مظاہر العلوم سہارنپور (انڈیا)، مدرسہ اشرف العلوم (ڈھاکہ) اور مدرسہ عالیہ کی مرکزی شاخ دار العلوم چندن پورہ (چاٹگام) میں سالہا سال تک درس وتدریس اور علومِ حدیث کی گراں قدر خدمات انجام دینے کے بعد بالآخر یہی فیصلہ کیا کہ وہ اپنی افتادِ طبع کے خلاف ان اداروں کی مصلحت کا شکار ہو کر تادیر ان کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ چنانچہ ڈھاکہ سے واپسی کے بعد انہوں نے کسی دار العلوم سے وابستگی قائم کرنے کی بجائے گورنمنٹ کالج ناظم آباد کراچی میں بطورِ استاد اسلامیات، ملازمت قبول کر لی اور اس مقدس پتھر کو چوم کر رکھ دیا۔ راقم الحروف کی افتادِ طبع بھی ان سے کچھ مختلف نہ تھی۔ میں نے اپنی ملازمت کا سلسلہ بطور استاد علومِ شرقیہ گورنمنٹ سکولوں سے شروع کیا اور گورنمنٹ ایلیمنٹری کالج کمالیہ سے ریٹائرمنٹ حاصل کی۔ بحمد اللہ ہم دونوں بھائیوں کو حق گوئی اور اظہارِ

خیال کی راہ میں کوئی ایسی رکاوٹ پیش نہ آئی جو ضمیر کی آواز دبانے یا اعتراف حقیقت کرنے سے مانع ہوسکتی تھی۔

تحدیث نعمت

میرے مضامین اور تالیفات کا مطالعہ کرنے والے حضرات اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اب تک میری جتنی علمی، تحقیقی تصانیف شائع ہوچکی ہیں، جن میں سے بعض کتابیں تو ناشرین کتب نے شائع کی ہیں اور ان میں سے بعض کتابیں میں نے خود بھی اپنے ادارے ''مطبوعات علمی'' سے شائع کرائی ہیں اور بحمداللہ ان کی تعداد دس تصانیف تک پہنچ چکی ہے، ان میں سے کسی ایک کتاب پر بھی میں نے کوئی عالمانہ القاب تو درکنار اپنے نام کے ساتھ لفظ ''مولانا'' لکھوانا بھی پسند نہیں کیا۔ زیرِنظر موضوع کیونکہ ایک انتہائی نازک اور علمی طور پر اختلافی موضوع ہے، اس لیے اپنے بارے میں برصغیر پاک و ہند کی ممتاز و قابلِ صد احترام علمی شخصیتوں کے تاثرات پیش کرنے پر بادل ناخواستہ مجبور ہو رہا ہوں اور یہ تاثرات بھی بطور اظہار تعلّی اور تفاخر کے نہیں بلکہ تحدیثِ نعمت کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔

1- حضرت حکیم الامت، مجددِ ملّت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہٗ میرے عہد طفولیت سے لے کر اپنی زندگی کے آخری دَم تک جو شفقت، محبت اس ناچیز پر فرماتے رہے، اس کے بیشتر عینی شاہد تو اَب دنیا سے رخصت ہوچکے ہیں اور جو چند ایک بقید حیات ہیں وہ جانتے ہیں کہ حضرتِ اقدس کے قریبی رشتہ داروں میں میرے کسی دوسرے ہم سِن رشتہ دار کو حضرت سے قرب و تعلق کی وہ خصوصیت حاصل نہ تھی جو اس ناچیز کے حصہ میں آئی۔ چنانچہ حضرت اقدس کے مرض الموت کے ایام میں حکیم نابینا دہلوی جو مولانا رشید احمد گنگوہی کے مریدانِ خاص میں تھے، ان کے شاگرد رشید حکیم سعید احمد گنگوہی بغرضِ علاج تھانہ بھون میں مقیم ہوگئے۔ حضرت کا علاج باقاعدگی سے شروع ہوا۔ صبح و شام نئے نسخے اور نئی دوائیں حضرت کے مرض میں تبدیلی کے پیش نظر بدل دی جاتی تھیں۔ ہر روز صبح و شام مرض کی کیفیات اور دواؤں کے اثرات کو حکیم صاحب کی خدمت میں پیش کرنے اور ان سے نئی دوائیں لے کر جنہیں حکیم صاحب خود اپنے ہاتھوں تیار کرتے تھے، حضرت کی خدمت میں پہنچانا اور دواؤں کے استعمال کے بارے میں تفصیلی ہدایات حضرت کی خدمتِ اقدس میں پیش کرنے کی سعادت چار ماہ تک اسی ناچیز کو حاصل رہی اور بالآخر

حضرت حکیم الامت کے نزع کا عالم میرے والد بزرگوار اور اس حقیر کی موجودگی میں گزرا۔ ہم دونوں ان کے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے، شہد ملا ہوا پانی منہ میں ڈالتے رہے، تاآنکہ اس چراغ علم و حکمت نے ہمارے ہاتھوں میں اپنی آخری سانسیں پوری کردیں۔ عالم نزع کی آخری کرامت یعنی حضرت کی انگشتِ شہادت میں ایک ننھے سے روشن ستارے کی چمک نمودار ہونے اور آخری سانس تک اس کے روشن رہنے کا اوّلین عینی شاہد بھی یہی گناہگار تھا، جس کی نشان دہی پر والدِ گرامی اور گھر کی تمام خواتین نے اس کا مشاہدہ کیا تھا۔ میری عمر اُس وقت صرف سترہ سال تھی۔ قریبی خاندانی رشتہ داروں میں حضرتِ اقدس کو یہ اعتماد اس ناچیز ہی پر تھا کہ مرض کی جو کیفیات حکیم صاحب تک پہنچانی ضروری ہیں، وہ پوری ذمہ داری کے ساتھ ان تک پہنچ جائیں گی اور پھر نئی دواؤں کے ساتھ ان کی ترکیب استعمال کی ہدایات بھی من و عن حاصل ہوجائیں گی۔ یہ زمانہ چونکہ میری طالب علمی کا تھا، اس لیے میرے بارے میں ان کی طرف سے کسی علمی رائے کے اظہار کی توقع تو نہیں کی جاسکتی تھی۔ البتہ برادرِ محترم مولانا عمر احمد عثمانی کی علمی استعداد، ان کی ذہانت اور ان کی علمی خدمات کے بارے میں حضرت حکیم الامت نے اپنے جو تاثرات ایک سند خاص میں بیان فرمائے ہیں، انہیں ''جامِ جمشید'' یا مولانا عمر احمد عثمانی کی گراں مایہ تالیف ''فقہ القرآن'' جلد اوّل میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

2- میرے والد شیخ الاسلام حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے میری کتاب ''امام راشد'' تذکرۂ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ پر بطورِ تقریظ اپنے جو علمی تاثرات اس ناچیز کے بارے میں تحریر فرمائے تھے وہ یہ ہیں:

> ''**بعد الحمد والصلوٰۃ** حضرت محدث ہند شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے مذہب اور سیاسی مسلک کے بارے میں عوام تو کیا بعض خواص تک غلط فہمی کا شکار ہوگئے ہیں۔ بارہا تقاضا ہوا کہ حضرت شاہ صاحب کی زندگی پر کوئی کتاب لکھوں جس میں ان غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے مگر فرصت نہ ملی۔ مجھے خوشی ہے کہ اس فریضہ کو میرے فرزند رشید مولوی قمر احمد عثمانی نے بڑی خوبی کے ساتھ انجام دے دیا۔ ابتدا میں حضرت سلطان عالمگیرؒ کی فقہ دانی پر اچھا لکھا ہے۔''

آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:

"شاہ صاحبؒ کے فقہی مسلک کے متعلق "امام راشد" میں کافی بحث کی گئی ہے اور مجھے یاد ہے کہ حضرت شاہ صاحب جب کسی کو سند حدیث دیتے تھے تو اس میں اپنے نام کے ساتھ "الحنفی مذھباً، النقشبندی مشرباً" تحریر فرماتے تھے۔ اس وقت ماخذ یاد نہیں رہا، غالباً حضرت حکیم الامت سے سنا تھا۔ شاہ صاحب نے مذاہب اربعہ میں جمع وتطبیق کی جو کوشش فرمائی ہے، ان سے پہلے شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ تلمیذ امام سیوطیؒ نے بھی اس کی کوششیں کی ہیں، اور اپنی کتاب "رحمۃ لامہ" میں اس کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ مذہب حنفی کے متعلق شاہ صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد بطور کشف نقل فرمایا ہے، بحمد اللہ کتاب "اعلاء السنن" میں اسی کے مطابق عمل کیا گیا ہے کہ اپنے ائمہ ثلاثہ میں سے جس کا قول حدیث کے زیادہ موافق پایا اختیار کیا گیا ہے بلکہ بعض مسائل میں امام شافعیؒ کے قول کو حنفیہ کے قول پر ترجیح دی گئی ہے اور لکھ دیا گیا کہ کتب احادیث موجود حنفیہ کی تائید میں کوئی حدیث نہیں ملی۔ ممکن ہے ہمارے ائمہ کے پاس کوئی حدیث ہو جو کتابوں میں ہم کو نہیں ملی، اس لیے بحالت موجودہ قول امام شافعیؒ قوی ہے اور ہم نے اس کو اختیار کیا ہے۔ ضرورت کے وقت ائمہ اربعہ میں سے کسی امام کے قول پر عمل کرنا حنفیہ کے نزدیک جائز ہے۔ چنانچہ مفقود کے بارے میں امام مالک کے قول پر عمل کرنے کو فقہ حنفیہ نے جائز کیا ہے اور حضرت حکیم الامت نے اپنی کتاب "الحیلۃ الناجزہ" میں بہت تفصیل کے ساتھ اس کو بیان فرمایا ہے۔ روحانیات میں شاہ صاحبؒ کا مسلک یہ ہے کہ کشفیات کو شریعت کے تابع کرتے ہیں، شریعت کو کشفیات کے تابع نہیں کرتے۔ سیاسیات میں شاہ صاحب متحدہ قومیت کے ہرگز قائل نہیں۔ اسی طرح زمین کی ملکیت کے بھی منکر نہیں، جو زمین

غیر آباد ہو، اس کو آباد کرنے والا جو سب سے پہلے آباد کرے اس کا مالک ہو جاتا ہے بشرطیکہ امام کی اجازت سے آباد کرے۔ کیونکہ دراصل جتنی بھی غیر آباد زمینیں ہیں، وہ سب بیت المال کی ہیں۔ ان میں تصرف کرنا بغیر امام کی اجازت کے درست نہیں۔ حدیث من احیا ارضا مواتا فھی لہ' کا یہی مطلب ہے، کیونکہ دوسری حدیث میں یہ بھی ہے لاحمی الا للّٰہ ورسولہ۔ دونوں کے مجموعہ سے یہی حکم نکلتا ہے کہ زمین غیر آباد کو امام کی اجازت سے آباد کیا جائے تو آباد کرنے والا مالک ہوگا ورنہ نہیں۔ معاشیات میں سودی کاروبار قطعاً ناجائز ہے البتہ اصولِ مضاربت پر بنک قائم کیے جائیں تو سودی کاروبار سے زیادہ ترقی ہوگی مگر اصول مضاربت کی رو سے یہ جائز نہیں کہ جماعت عاملہ منتظمہ کی تنخواہ مقرر کی جائے بلکہ ان کو نفع میں شریک کیا جائے خواہ نصف ان کا ہو، نصف سرمایہ لگانے والوں کا ہو، یا تہائی، چوتھائی نفع دیا جائے جو مناسب ہو۔ آخر میں شاہ صاحب کا مسلمانوں کے مختلف طبقات سے خطاب جو بیان کیا گیا ہے، وہ اس قابل ہے کہ برابر اس کی اشاعت ہوتی رہے۔

دُعا کر رہا ہوں اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبول فرمائے اور مسلمانوں کو اس سے منتفع فرمائے اور اس کی اشاعت زیادہ سے زیادہ ہو جائے۔ والحمد للہ رب العٰلمین۔

(ظفر احمد عثمانی، 12 صفر 1392ھ)

ب۔ مولانا وجیہ الدین صاحب مفتی دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار، تحریر فرماتے ہیں کہ:

"حامداً ومصلیاً ومسلماً، احقر نے حسبِ ارشاد شیخ الحدیث حضرت العلامۃ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب، اِس رسالہ "امام راشد" کا مطالعہ کیا۔ احقر کے تاثرات بھی اس رسالہ کے بارے وہی ہیں جو حضرت مولانا مدظلہ العالی نے تحریر فرمائے ہیں۔"

(احقر از نام محمد وجیہ الدین)

ج۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہٗ:

تقریظ

''بعد الحمد والصلوٰۃ، میرے قابل، فاضل اور لائق فرزند مولوی قمر احمد عثمانی سلمہٗ کا یہ دوسرا علمی کارنامہ ہے۔ اس سے پہلے شاہ ولی اللہؒ صاحب پر ''امامِ راشد'' کے نام سے وہ ایک کتاب لکھ چکے ہیں جو شائع ہو چکی ہے اور عام طور پر پسند کی گئی۔ یہ ان کی دوسری علمی کاوش ہے، جو مجدّدِ وقت حضرتِ اقدس مولانا سیّد احمد شہیدؒ بریلوی کے اصلاح وتبلیغ، اجرائے فریضۂ حج، ابطالِ رسوم جاہلیت اور احیائے فریضۂ جہاد وہجرت میں ان کے مجددانہ کارناموں پر مشتمل ہے۔ اس کو پڑھ کر ناظرین کو اس مقولہ کی سچائی میں شبہ نہ رہے گا کہ ''کم ترک الاوّل الآخر''۔ سید صاحبؒ ممدوح پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں، مگر اس کتاب کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی باتیں اس کتاب میں ایسی ہیں جن پر پہلے مصنفوں نے توجہ نہیں فرمائی۔''

اسی تقریظ میں آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:

''آخر میں یہ بھی بتادوں کہ اس رسالہ کا اندازِ بیاں ایسا اثر انگیز ہے کہ جب میں نے اس کو اپنے لائق فرزند کی زبانی حرفاً حرفاً سنا تو بعض مقامات پر خود مصنف پر رِقت طاری ہوگئی اور بے ساختہ آنسو رواں ہوگئے۔

دُعا ہے کہ حق تعالیٰ اس رسالے کو مقبول اور مسلمانوں کے لیے عموماً اور حکومت ہائے اسلامیہ کے لیے خصوصاً نافع اور مفید بنائیں اور ہم سب کو اقامتِ شریعت، اتباعِ سنت اور جذبۂ جہاد سے مالا مال فرمائیں۔ والسلام

ظفر احمد عثمانی

بروز جمعہ 16، ج2، 1392ھ، 28 جولائی 1972ء